آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

ہندستان کی شماریاتِ آبادی

ڈاکٹر جعفر حسن

ہندستان کی شماریات آبادی

اور

عمرانیاتی تشریح

ڈاکٹر جعفر حسن

سنہ ۱۹۴۵

ملنے کا پتہ

حیدرآباد بک ڈپو

سٹیٹ بنک روڈ

حیدرآباد دکن

قیمت مجلد ۳-۱۲-۰۰

فہرست

ہندستان کی شماریات آبادی اور اس کی عمرانیاتی تشریح

پیش لفظ

تمہید

آبادی کے مسئلے ۲۶

پیش لفظ

۱۹۶۱ء کے جدید اعداد کی روشنی میں میں نے مسئلہ آبادی پر جو تبصرہ کیا ہے اور سیاست و معیشت، سماج اور زبان، تعلیم اور صحت عامہ سے تعلق رکھنے والے امور پر جو کتاب مرتب کی ہے اس کے بعض حصے "سیاست" میں شایع ہوئے ہیں۔ آخر کے تین چار صفحے بلکل نئے ہیں۔

ان ہی شایع شدہ مضمونوں کی زائد کاپیوں کو یکجا مرتب کر کے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ جن حضرات کو آبادی اور مرفہ الحالی کے مسئلوں سے دلچسپی ہو اور ان مضمونوں کے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو انہیں سہولت ہو۔

شعبۂ معاشیات کے فاضل اساتذہ جناب عبد القادر صاحب اور امتیاز حسین خان صاحب کا میں ممنون ہوں کہ انہوں نے ان مضمونوں کی اشاعت میں دلچسپی لی اور حتی المقدور صحیح لکھائی اور چھپائی کی خاطر زحمتیں اٹھائیں۔ اس کے باوجود بھی اگر ایسی غلطیاں رہ جائیں کہ "ہندستان میں ۱۰۰ پیدائشوں میں ۱۶۰ موتیں ہوتی ہیں" تو اس کے وہ ذمہ دار نہیں۔ اس کی ذمہ داری..... یہ دوسرا مسئلہ ہے جس پر تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں۔

ہندستان کی شماریات آبادی

اور

عمرانیاتی تشریح

ڈاکٹر جعفر حسن صدر شعبۂ عمرانیات، جامعہ عثمانیہ

گنا دے کا مفہوم

انسانی آبادی کی گنتی، مختلف معاشی اور سماجی حیثیتوں کی کیفیت، آبادی کی جنسی، عمر داری، پیشہ وری تقسیم، مختلف طبقوں، فرقوں، قوموں، نسلوں، جماعتوں کی تعلیمی و تمدنی کیفیت، بیاہوں اور بن بیاہوں کی تعداد، بیاہ کے وقت ان کی عمریں، بچوں کی تعداد، پہلی اولاد کی پیدائش کے وقت والدین کی عمریں آخری اولاد کی پیدائش کے وقت والدین کی عمریں، شرح پیدائش، شرح بق، شدید بیماریوں اور وباؤں میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد اور مرنے والوں کی شرح، کل اموات کی تعداد اور شرح، رنڈووں اور بیواؤں کی تعداد اور شرح، کمانے اور کھانے والوں کی تعداد، ذرایع معاش، اوسط فی کس آمدنی، سرمایہ یا مقروضیت کی کیفیت، زیر کاشت اور افتادہ زمینوں کا رقبہ، پیداوار فی مربع میل، زرعی جانوروں، غذائی جانوروں اور استعمالی جانوروں کی تعداد اور ان کے باہمی

تقابل کو سنسس کہتے ہیں۔ یہ جدید زمانے ہی کی خصوصیت ہے کہ ہر دہائی (دس برسوں کی مدت) کے بعد تمام ترقی پذیر ملکوں میں باضابطہ طور پر آبادی کی تعداد اور نوعیت معلوم کی جاتی ہے اور مختلف معاشی، سماجی، سیاسی، تعلیمی، اخلاقی اور صحت عامہ سے متعلق حقایق کو اعداد و شمار میں واضح کیا جاتا ہے۔ غرض تہذیب و تمدن کے بہتیرے امور پر اعداد و شمار اکٹھا کئے جاتے ہیں اور ان اعداد و شمار اعداد کو دیکھنے اور دوسرے ملکوں کے اعداد سے ان کا مقابلہ کرنے سے بڑی دلچسپ، حیرت انگیز اور بشرط بصیرت، سبق آموز باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

یہ اعداد سبق سکھانے اور الجھنے میں ڈالنے والے ہوں یا نہ ہوں، مگر وہ دلچسپ ضرور ہیں، کم سے کم ان لوگوں کے لئے جو اپنی تہذیب و تمدن کی اصلیت معلوم کرنا چاہتے ہوں اور جہاں تک ہو سکے حقایق کی روشنی میں اپنی رائے اور فیصلے قائم کرنا چاہتے ہوں۔

سب سے پہلے یہی ذہن نشیں کرنا چاہئے کہ سنس کو مردم شماری کہنا ٹھیک نہیں! کیوں ٹھیک نہیں؟ اس کے بارے میں سب سے پہلے ایک لطیفہ سنئے!

مردم شماری یا گنا وا؟

کسی ضلع کی خبر تھی: "According to the latest census there are 25,000 buffaloes in our district."

دفتر کے سرکاری مترجم نے لکھ دیا:

"حالیہ مردم شماری کے مطابق ہمارے ضلع میں
پچیس ہزار بھینسیں ہیں!"

انسانوں کی گنتی سے بھینسوں کی تعداد معلوم کرنا، کیا خوب! اس لطیفے سے ہم یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ مترجم سے زیادہ یہ ہماری زبان کا قصور ہے جس میں Census کے لئے صرف مردم شماری کا لفظ ہے اور یہ لفظ Census کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں۔

آپ جانتے ہیں ہندی میں اسے کیا کہتے ہیں؟ **मनुष्य गणना**

یعنی (منشیہ گننا) کیسا ثقیل لفظ ہے! سنسکرتیت میں ڈوبا ہوا۔ بوجھل اور معنے وہی مردم شماری

لہٰذا ناقص اور نامکمل! جس طرح ہمارے لئے منشیہ گنرنا کی ترکیب ناقابل قبول ویسی ہی مردم شماری کی اصطلاح ہندی دانوں کے لئے ناقابل فہم! کیونکہ صرف "مردم" کا لفظ اردو میں استعمال نہیں ہوتا۔ انسان شماری یا آدمی شماری ہوتا تو بھی غنیمت تھا کیونکہ اردو میں کہتے ہی ہیں کہ "دس آدمی آچکے ہیں!" "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!" مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ "دو مردم آچکے ہیں" "اس گانو میں ... ۲ مردم ہیں!" چونکہ ہم مردم کا لفظ نہیں بولتے لہٰذا اس کے سمجھنے میں ہندی دانوں کو دقت ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ بدرجہا بہتر ہوگا کہ سنسس کو گنا وا کہا جائے جو نہ صرف جامع اصطلاح ہے بلکہ ہندی دانوں اور اردو دانوں کے لئے یکساں آساں۔ بہرحال آپ مانیں یا نہ مانیں، ایک تجویز تو میں نے پیش کردی۔ ایسے ہی لفظ ہندی اور اردو کا مشترک سرمایہ ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ہم بے تعصبی سے ان کا استعمال کریں اور اردو داں فارسیت زدگی سے بچ کر ہندی اردو میں مستعمل لفظوں سے بنائی ہوئی اصطلاحوں کی مخالفت نہ کریں، مردم شماری اور منشیہ گنرنا بوجھل اور کٹھن ہونے کے علاوہ سنس کے پورے مفہوم کو ادا نہیں کرسکتے۔ اس لئے ایک نیا لفظ ضروری تھا اور میرا خیال ہے کہ اس مفہوم کو گنا وا صحیح ادا کرتا ہے جو ہندی اور اردو دونوں کے لئے آسان ہوگا۔

کیا اعداد صحیح ہوتے ہیں

اعداد و شمار کے متعلق یہ طنزیہ فقرہ مغربی ملکوں کے علمی حلقوں میں بہت مشہور ہے کہ

"جھوٹ کی تین قسمیں ہیں: ایک تو معمولی جھوٹ،
دوسری بڑا جھوٹ اور تیسری اعداد و شمار!"

یہ طنزیہ فقرہ بالکل بے بنیاد نہیں کیوں کہ نااہلی، مطلب پرستی یا نادانی کی وجہ سے غلط سلط اعداد جمع کرنے جاتے ہیں یا ان میں عمداً کمی بیشی کی جاتی ہے یا ان کو "توڑ مروڑ" کر پیش کیا جاتا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ غلط، متاثرہ اور تبدیل شدہ اعداد کے ذریعہ "استدلال" کرنا صرف اعداد تک مخصوص نہیں ہے، اکثر بیانات، گواہیاں، تحریریں اور نام نہاد علمی مقالے اور تحقیقی کتابیں بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں: کچھ باتیں نااہل لوگ سچ مان کر لکھ دیتے ہیں،

کچھ باتیں غرض مند، متعصب یا فتنہ انگیز لوگ جان بوجھ کر یا نیم شعوری طور پر بدل کر پیش کرتے ہیں اور کچھ نادان لوگ اپنی عقل کے زعم میں ناقص یا ناکافی تحقیق سے سچ مان لیتے ہیں۔

بہر حال اعداد و شمار کی حد تک یہ سچ ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ وہ بعض مرتبہ محض فرضی، اکثر "رنگین" اور صرف چند صورتوں میں غیر جانب دارانہ ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی قابل بھروسہ اہل افراد کے ذریعہ جمع کئے جاتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ سب اعداد و شمار یکلخت غلط ہوتے ہیں، نیز ہوشیار واقف کاروں یا تجربہ کار ماہروں کے لئے بلکہ ذہین نقادوں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ان مختلف قسم کے اعداد و شمار میں فرق پیدا کر سکیں علمیات اور منطق کے اصولوں کو منطبق کر کے یا محض عام معلومات اور فہم عامہ کی مدد سے ہم کھرے کھوٹے اعداد پرکھ سکتے ہیں۔

سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے اور سچ اور جھوٹ کی ملاوٹ کو تاڑنے کے لئے جو معیار منطق اور علمیات نے دریافت کئے ہیں ان ہی کی مدد سے اعداد کی درجہ بندی ہو سکی ہے مثلاً ہمیں یہ خیال کرنا چاہئے کہ

"اعداد و شمار کا کیا ماخذ ہے؟

کیا یہ ماخذ ہر قسم کے اعداد و شمار کی صحت کا ضامن ہو سکتا ہے؟"

ہمیں معلوم ہے کہ ہندستان کی سروے کئی بار ہو چکی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ ۱۵ لاکھ، ۸۱ ہزار پانسو دس مربع میل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ناپ یا حساب کی غلطیوں کی وجہ سے اس کا حقیقی رقبہ کچھ اور ہو یا سیاسی مقبوضات میں تبدیلی یا انتظامی تبدیلیوں کی وجہ سے اس کا صحیح رقبہ یہ نہ ہو مگر اتنا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ رقبہ پندرہ لاکھ سے زیادہ اور ساڑھے سولہ لاکھ چوکور میل سے کم ہے۔ اور یہ غلطی بھی ناپ اور حساب کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ ہم فہم عامہ کی مدد سے کوئی وجہ نہیں سوچ سکتے کہ ان اعداد کے غلط کرنے میں کسی فریق کی بھی کیا غرض ہو سکتی ہے لہذا رقبوں کی وسعت، ندیوں کی لمبائی، پہاڑی چوٹیوں کی اونچائی، سمندر کی گہرائی وغیرہ کی

حد تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف ہندستان بلکہ تمام دنیا کے اعداد تقریباً صحیح ہیں۔ البتہ جب ہم ہندستان کے معاشی، سیاسی اور سماجی واقعات کو اعداد و شمار کی روشنی میں معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کئی دقتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ

۱۔ توہم پرستی، یا لاپرواہی کی وجہ سے خود لوگ غلط بیانی کرتے ہیں اور صحیح واقعات بتانے سے انکار کرتے ہیں۔

۲۔ نا اہل، کم تجربہ کار اور سہل کار شمار کنندے انٹ شنٹ اندراج کرلیتے ہیں۔ ان کے علٰحدہ کرنے اور جمع کرنے میں مزید غلطیاں ہوتی ہیں۔

۳۔ آخر میں غرض مند یا حاکم طبقہ اپنی سہولت اور فایدہ کی وجہ سے اس میں اور تبدیلیاں کرتا ہے یا من مانے طور پر کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔

ہندستان اور ہندستان کی طرح تمام زوالی اور جمودی ملکوں میں لوگ گنا وے کی نوعیت اور اہمیت سے ناواقف ہیں۔ بہتیری مائیں اپنی اولاد کی صحیح تعداد بتانے کو بدشگونی تصور کرتی ہیں! ہزاروں لوگ ہیں جو خاص کر اپنی بیٹیوں کی تعداد بتانے میں "ایشیائی شرم و غیرت" دبا، محسوس کرتے ہیں۔ بعض مشرق پرست یا مشرق پسند افراد ہیں جنھوں نے دو دو تین تین بیاہ کرلئے ہیں یا ایک باضابطہ بیوی کے علاوہ دوسرا نکاح چوری چھپی کر لیا ہے مگر یہ سب باتیں شمار کندہ کو بتاتے ہوئے انھیں "شرم" آتی ہے! بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی بیاہتا بیوی کو "عالم برزخ" میں پہنچا دیا ہے اور کسی نئی نویلی کے ساتھ گذر بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بھی کثرت ازدواج کو ظاہر نہیں کرتے۔ غرض سیکڑوں مختلف وجہوں سے لوگ جانتے بوجھتے غلط بیانی کرتے ہیں یا سچ باتوں کو چھپاتے ہیں۔ غرض مندی، مطلب پرستی، نخوت اور شرم کے علاوہ محض شیخی سے غلط بیانی کرتے ہیں اور بوڑھے اپنی عمر کم لکھانے میں، پڑھے لکھے اپنی زبان دانیاں جتانے میں ایسا مبالغہ کرتے ہیں کہ اسے سفید جھوٹ سے تعبیر کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔ روگیوں اور معذوروں کی تعداد چھپانا اور پڑھے لکھوں کی تعداد بڑھانا ایک عام مرض ہے! خاندانی لاج!

ہندستان میں بہتیرے شمار کنندے گناوے کا کام اعزازی طور پر انجام دیتے ہیں، مرکزی دفتروں میں کئی لوگ ہوتے ہیں جو شماریات کے فن اور اصول سے ناواقف یا برائے نام واقف ہوتے ہیں، اکثریت میں تساہل اور سہل کاری پائی جاتی ہے۔ بعض شمار کنندے، خاص کر دیہات میں، خود نیم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، ورنہ تو شماریاتی محکموں کی ہدایتوں کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کی پروا کرتے ہیں۔ میں نے گشتیاں دیکھی ہیں جو ایسی پیچیدہ زبان میں لکھی تھیں کہ ان کا سمجھنا رازدار تحریر کی تحقیق کرنے کے برابر تھا!

عام طور پر عمر واری تقسیم کے اعداد بڑے غلط ہوتے ہیں کیونکہ خود لوگوں کو اپنی عمریں نہ تو معلوم ہوتی ہیں اور نہ یاد رہتی ہیں! شمار کنندہ صاحب کسی تاریخی واقعہ یا فطری سانحہ کی مدد سے عمر معلوم کر لیتے ہیں اور اٹکل سے لکھ ڈالتے ہیں۔ ایک بوڑھے اور بچہ میں تو فرق کرنا آسان ہے مگر بیس سے پچاس برس تک کی عمر والوں میں درجہ بندی کرنا آسان نہیں، خاص کر جب کہ عورتیں پردے میں ہوں اور ——— مردوں کے ڈاڑھی ہو!

یہاں مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ ۱۹۴۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ احباب کے سامنے میں ان ہی خیالوں کو بیان کر چکا تھا۔ آخر ایک دن جب کہ ہمارے گھر ایک سکھ مہمان آئے ہوئے تھے میں نے ایک دوست سے جنھیں عمر شناسی کا بڑا دعوے تھا، اپنے سکھ مہمان کی عمر دریافت کی۔ ان کی والدہ بھی ساتھ تھیں، جن کے چہرے پر غروب حسن کا آخری نور تھا۔ میرے دوست نے بیٹے کی عمر ۴۰ اور ماں کی عمر ۳۵ بتائی! انھیں معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ وہ بھائی بہن نہیں، بلکہ ماں بیٹے ہیں جن کی صحیح عمریں ۲۷ اور ۴۲ ہیں!

عمروں سے زیادہ وجہ موت متعین کرنا بہت دشوار ہے۔ سانپ کے کاٹے اور طاعون میں فرق کرنا یا ہیضے یا چیچک سے ہونے والی اموات میں فرق کرنا، نسبتاً آسان ہے مگر "بخار" سے واقع ہونے والی موتوں میں فرق کرنا کیوں کر ممکن ہے؟ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ملیریا، ٹائیفائیڈ، دق اور گردن توڑ بخار کے مختلف اعداد نہیں ملتے اور اعداد کے نہ ہونے کو اچھے اچھے لوگ بیماری کا نہ ہونا تصور کر لیتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، چند سال پیشتر ہمارے ملک کے ایک بڑے ادیب نے، جو خود فلسفہ اور منطق کے عالم ہیں اور سچائی کے مبلغ اور دعوے دار بھی، دق سے مرنے والوں کی تعداد کا حوالہ دے کر، یہ "ثابت" کیا تھا کہ ہمارے ملک میں دق کم ہے اور امریکہ میں زیادہ اور اپنے بیان کے ثبوت میں انھوں نے سرکاری اعداد پیش کئے تھے! ان کے ادیبانہ شذرے کا لب لباب یہ تھا، یورپ اور امریکہ کی تہذیب و ترقی کے باوجود وہاں دق پھیل رہا ہے اور کتنے ہزاروں آدمی صحت گاہوں اور ماہروں، ہسپتالوں اور دق کے انسدادی اداروں کے ہوتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں مگر ہمارے ہاں نسبتاً اور مقابلتاً مشرقیت، خاندانی طریق زندگی کے باوجود بفضلہ خیریت ہے! ایک اور موقع پر موصوف ہی نے امریکہ کے مجرموں، ملزموں اور مجرمانہ مقدموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا حوالہ دے کر ان کا تقابل ہندستان کے اعداد سے کرتے ہوئے مغربیت کی زوال پذیری اور مشرقیت کی برتری، اخلاقی عظمت اور روحانی استحکام کا ثبوت دینا چاہا تھا۔ اعداد سرکاری ماخذوں سے لئے گئے تھے اور بالکل ٹھیک تھے اور اس تقابل سے یقیناً پڑھنے والوں کی عظیم ترین اکثریت کو دھوکہ ہوا ہوگا اور وہ اعداد و شمار سے واضح کردہ بلندی و پستی کے قایل ہوگئے ہوں گے۔ اس شذرے کے جواب میں مَیں نے ایک معروضہ لکھا اور توقع کی تھی کہ صداقت کی خاطر اس کو بھی شایع کر دیا جائیگا کہ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کے بڑھنے کے کئی سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ آبادی بڑھ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب سے اگر مجرموں، ملزموں اور مجرمانہ مقدموں میں اضافہ ہو تو یہ مطلق معنے میں اضافہ نہیں، صرف اضافی معنے میں اضافہ ہے! بلاشبہہ ہندستان کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا لہٰذا غیر جانب دارانہ تقابل کے لئے لازمی تھے کہ خود ہندستان کے دس بیس اور تیس سال پہلے کے اعداد دئے جاتے۔ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کے زیادہ ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ امریکہ ایک ترقی پذیر ملک ہونے کی حیثیت سے اپنی تنظیم کو بڑھا رہا ہے، اس کا جرم تفتیشی محکمہ بلند تر معیار پر پہنچ گیا ہے۔ امریکہ میں سختی سے قوانین کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ بڑا چھوٹا، امیر غریب، صدر کا بیٹا اور قلی کا بیٹا، عالم کا لڑکا اور کسان کا لڑکا، سب ایک ہیں، عدالت عالیہ سے بے نیاز

ہے۔ بلاشبہ ناانصافیاں ہوتی ہیں، رعایتیں ہوتی ہیں، مہربانیاں کی جاتی ہیں معصوموں کو
پھانسا جاتا ہے مگر نسبتاً بہت کم کیونکہ عدالت اور عاملے کی تفریق سے مرعوبیت کا امکان نہیں،
علانیہ اطاعت گذاری اور فرماں برداری قطعی طور پر ناممکن! اسی طرح رشوت ستانی کی وہ گرم بازاری
نہیں جو مشرقی ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ ان حقیقتوں کے برعکس ہمارے ہاں مجرموں کی تحقیق و تفتیش
کرنا تو بڑی بات ہے، جن جرموں اور مجرموں کا پتہ چلتا ہے وہ بھی گوناگوں اسباب کی بنا پر منظر عام پر
نہیں آنے پاتے اور منظر عام پر آ بھی جائیں تو انھیں رجسٹر پر نہیں چڑھایا جاتا اور نہ عدالت کے
سامنے پیش کیا جاتا ہے اور رجسٹر پر چڑھا بھی دیا جائے تو بعد میں نظر انداز کیا جاتا ہے اور
کارگذاری ثابت کرنے یا کسی اور غرض یا مصلحت سے چھپا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سنی سنائی
یا قطعاً ناقابل بھروسہ حوالوں کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی معلومات سے میں کہہ سکتا ہوں کہ حادثے،
قابل انسداد، حادثے، ہوتے ہیں جن کا ذکر سرکاری رپورٹ میں نہیں ہوتا، مشتبہ حالات
کے تحت کوئی "غائب" ہو گیا مگر کھوج نہیں کیا گیا، ہٹا کٹا تن درست توانا لڑکا "سانپ کے
کاٹے" سے مر گیا اور لاش بغیر تفتیش نذر آتش کر دی گئی، لوگوں نے خودکشی کر لی مگر وجہ موت
خاندان والوں نے چھپائی اور افسر معلومات کے باوجود انجان بن گئے دبا کے زمانے میں
محلہ والے مر گئے تو تعداد کم ظاہر کی گئی یا بالکل چھپا کر لکھ دیا کہ "فلاں فلاں محلوں میں فضل رہا!"
یہ ایک عام واقفیت ہے کہ یورپی اقوام سچائی کی قربانی صرف جنگ کے زمانے میں کرتے ہیں
اور حقیقی نقصان بتانے سے گریز کرتے ہیں، ہمارا یہ وتیرہ امن میں بھی ہوتا ہے! پھر بھی اچھے اچھے
واقف کار، منطقی اور فلسفہ کے جانے پہچانے اصولوں سے مسلح 'صداقت کے مبلغ' یا تو دھوکہ کھاتے
ہیں، یا دھوکہ دیتے ہیں! اور ایک نادان مبلغ کی حیثیت سے خود گمراہ ہو کر دوسروں کو مغالطے
میں ڈالتے ہیں یا ایک تنگ نظر عقلیت زدہ محقق کی حیثیت سے اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا
باعث بنتے ہیں۔ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کا مقابلہ تعلیمی نقطہ نظر سے امریکہ کے ہم درجہ اور
امریکہ کی طرح آزاد ملک سے ہو سکتا ہے! ہندستان جیسے مفتوح، محکوم اور نااہل ملک سے
جرمیاتی اعداد کا مقابلہ کرنا اور اس تقابل سے اپنی برتری کا ثبوت اخذ کرنا تعلیم یافتہ

مشرقیوں کی بھولی غفلیت اور بر خود فریفتہ منطقیوں کی رعونت ہے!

اس امر کو معلوم کرنے کے لئے کہ "کیا اعداد صحیح ہوتے ہیں؟" ہمیں شماریات اور سیاست کے باہمی تعلق پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ ہر حکومت اپنی پالیسی کو جائز اور مفید ظاہر کرنے کے لئے اپنے مطلب کی باتوں کی تشہیر کرتی ہے اور اپنے خلاف مواد کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ خاص کر آمریت اور سامراجیت میں دروغ بافی اور جھوٹے سچے اعداد کی طواہٹ اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انگریزی حکومت انگلستان میں ادرہے، ہندستان میں اور! جاپان میں جاپانیوں کی حکومت کے بارے میں جو کچھ جاپانی کہتے ہیں یا اپنی صنعت وحرفت، زراعت وتجارت کے بارے میں جو کچھ اعداد پیش کرتے ہیں، اسے خواہ مخواہ غلط تصور کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں، مگر یہی جاپانی جب کوریا کی صنعت وحرفت کی ترقی کے ابھارے ہوئے اعداد[1] پیش کرتے ہیں، اور شرح اموات کو گھٹا کر بیان کرتے ہیں تو ہمیں احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ حاکم ومحکوم کے مفادوں میں تضاد ہوتا ہے اور تضاد کے باوجود ہم آہنگی ظاہر کرنے کی کوشش میں اعداد پر رنگ چڑھانا گویا لازمی ہوجاتا ہے، یہی حال، جزوی طور پر دہاں پایا جاتا ہے جہاں حکومت طبقہ واری یا فرقہ واری ہوتی ہے اور اس لئے ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیئے، اور رنگ آمیزی کے احتمال کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

ہندستان میں گناوے کی اہمیت

اعداد وشمار تمدن فہمی کے لئے ضروری تو ہیں ہی، اس کے علاوہ وہ سرکاری پالیسی اور قومی سیاست کی تشکیل میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ قومی تعمیری تحریکوں اور قومی تعمیری محکموں میں اعداد و

---

[1] ابھارے ہوئے اعداد یا ابھرائے ہوئے Inflated figures

شمار کی اور زیادہ اہمیت ہے مستقبل کی تنظیم میں موجودہ زمانے کے اعداد سے بڑی مدد مل سکتی ہے، بشرطیکہ اعداد صحیح ہوں! ورنہ گمراہی کا خطرہ ہوتا ہے۔ البتہ یہ سب خصوصیتیں ہر ملک کے گناوے میں ہوتی ہیں۔ ہندستان میں گناوے کی غیر معمولی اہمیت کی دو اور وجہیں ہیں: سرکاری خدمتوں اور ملازمتوں کا ہندیانا اور قانون بنانے والی مجلسوں میں فرقہ واری نیابت!

ہندیانا یعنی INDIANIZATION

دو سو سال پہلے تک تقریباً سارے ہندستان میں ہندستانیوں کا راج تھا۔ بڑے سے بڑے افسر سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے خدمتگار تک اور ملک التجار سے لے کر چلر فروش تک، بڑے بڑے ٹھیکہ داروں سے لے کر معمولی کسانوں، دہقانوں تک سب کے سب ہندستانی ہوتے تھے یا ہمیشہ کے لئے ہندستان آکر بس جانے والے ہوتے تھے۔

فرنگی حکومت کے استحکام کے ساتھ ہی ہندستان کی سیاست اور معیشت میں ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی جس سے ہندستان کو اس سے قبل سابقہ نہیں ہوا تھا؛ وہ یہ کہ قدیم آریاؤں یا مسلمان حملہ آوروں کی طرح یہ فرنگی نہیں آرہے تھے اور نہ ہمیشہ کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر ہندستان میں آ بسنے کے لئے آتے تھے بلکہ ان کا مقصد تجارت، خدمت، ملازمت یا حکومت ہوتا تھا اور وہ تھوڑے عرصے میں جتنا ہو سکے کما کر اپنے وطن واپس چلے جاتے تھے اور کبھی مستقل طور پر وطن بسائی کی خاطر نہیں آتے تھے۔

تبدیل شدہ سیاست اور حکومت کا یہ نتیجہ ہوا کہ مختصر یا طویل عرصوں کے لئے یا فوجی یا سیول خدمتوں کو انجام دینے کی خاطر آنے جانے والوں کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ کوئی بھولا بھٹکا قسمت کا مارا ہندستان میں رہ پڑا تو رہ گیا ورنہ عام طور پر سب عہدہ دار اور تاجر، ٹھیکہ دار اور دوسرے پیشہ ور چند برسوں کے لئے قیام کرکے اور زیادہ سے زیادہ پچیس تیس سال بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ اسی لئے ہندستان میں ایک ایسا حاکم طبقہ وجود میں آیا جس کے افراد مستقل طور پر ہندستان میں نہیں رہتے تھے، اور ہندستانی تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے، ہیں اور رہینگے!

جب تک انسان ہمیشہ کے لئے ترک وطن کرکے نئے وطن میں نہیں آ بستا، وہ بیگانہ ہی رہتا ہے اور

اسے اپنے ہی ملک سے لگاؤ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے برخلاف پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور ظاہر ہے سب سے بڑھ کر انگریزوں کی بدولت ہندستانیوں کو نقصان پہنچا اور ان کی تہذیب حکومت کی امداد اور سرکار کی سرپرستی سے محروم ہوگئی۔ سب سے بڑا نقصان تو یہی تھا کہ تمام بڑے بڑے عہدے غیر ہندستانیوں کے ہاتھوں میں تھے اور تمام بڑے بڑے ٹھیکے انگریزی کمپنیوں کو ملتے تھے صنعت و حرفت، تجارت، بنک کاری، وکالت، بیمہ، تعلیم اور فن کاری کے توسط اور ـــ بہانے سے ہزاروں نہیں لاکھوں انگریزوں کو براہ راست اور بالواسطہ فایدہ پہنچتا رہا، اب بھی پہنچ رہا ہے اور جب تک ان کی مطلق العنانی قائم رہے گی یہی من مانا فایدہ پہنچتا رہے گا۔ وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ فوج کے تمام چھوٹے بڑے افسر، سپہ سالار، صناع، موسیقی اور مصوری کے ماہر، عہدہ دار، تاجر سب کے سب ہندستانی ہوں، تمام بڑے عہدے انگریزوں کے سپرد ہوئے، اور صرف ادنےٰ ملازمتیں ہندستانیوں کے لئے مختص ہوئیں۔

اب تو چند نیم اہم یا کم اہم محکموں کے اعلےٰ انتظامی افسر ہندستانی ہیں، اور تقریباً تمام محکموں اور سررشتوں میں ہندستانیوں کا تقرر کیا جاچکا ہے مگر پچاس ساٹھ سال قبل ہماری حالت اور بھی بدتر تھی کیوں کہ اس وقت بلا استثنا تمام اچھے عہدوں پر انگریز ہی انگریز ہوتے تھے۔ جیسے جیسے ہندستانی اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں اور عزت و آزادی کے لئے قربانیاں کر رہے ہیں، اسی قدر ملک کے انتظامی عہدوں پر ہندستانیوں کا تقرر بڑھتی ہوئی تعداد اور تناسب سے کیا جا رہا ہے اور گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سب سے پہلے ایک ہندستانی کو ایک صوبے کا گورنر بنایا گیا تھا اور اس کے بعد کئی ہندستانیوں کو اس قابل تصور کیا گیا کہ منصرمانہ طور پر گورنری کریں! مگر اب تک فینانس، مالگزاری، فوج جیسے محکموں پر کسی ہندستانی کا تقرر محکمے کے اعلےٰ ترین افسر کی حیثیت سے نہیں کیا گیا اور نہ کسی اور محکمے میں تمام اختیار ہندستانیوں کے سپرد کر دئے گئے بلکہ ہر جگہ، حتیٰ کہ تعلیم اور صفائی کے سررشتوں میں قواعد کی تبدیلی، نافذہ قانون کی تنسیخ، عہدہ داروں کی برطرفی یا معطلی گورنر کے ہاتھ میں اور گورنر کو ہٹانے کا حق وائسرائے کو ہے اور وائسرائے سے استعفیٰ طلب کرنے کا مجاز وزیر ہند، وزیر ہند کا مختار وزیر اعظم ہے جو صرف اپنی پارٹی اور

برطانوی پارلیمان کے ماتحت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں تک نوبت نہیں آنے پاتی یا سب مخالفتیں
ساتھ ساتھ یا وقت واحد میں نہیں ہوتیں مگر اصولی طور پر یہ کہنا صحیح ہے کہ تمام ملک کا سارا انتظام
آج بھی دستوری طور پر انگریزوں کے ہاتھوں میں ہے مگر وہ لوگ زمانے کی ہوا کے ساتھ ساتھ اپنے
اختیار خود ہی کم استعمال کرتے ہیں اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہندستانیوں کو مختلف عہدوں پر
مقرر کرتے ہیں۔ اسی کو اصطلاحی زبان میں **Indianization** یعنے ہندیاؤ کہتے
ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کے مختلف محکموں میں اور ہر محکمے کے مختلف درجے یا نوعیت
کے عہدوں پر انگریزوں کی بجائے ہندستانیوں کا تقرر کرنا، ٹھیکوں کی تقسیم میں ہندستانی کاروباریوں کا
لحاظ رکھنا، سرکاری وکیل یا ماہر مقرر کرتے وقت ہندستانیوں کو بھی مد نظر رکھنا، تحقیقاتی،
تفتیشی، مشاورتی، قانونی، عدالتی کمیٹیوں، کمیشنوں، مجلسوں وغیرہ میں ہندستانیوں کی تعداد
اور تناسب کو بڑھانا، ان میں اہم خدمتوں پر ہندستانیوں کا تقرر کرنا۔ ہندیادی تحریک کا آغاز
یوں تو گزشتہ صدی ہی میں ہو چکا تھا مگر تقسیم بنگال، روس، جاپانی جنگ، سودیشی تحریک، تحریک
خودمختاری، پہلی جنگ عظیم جیسی اثر انگیز واقعات سے اس کو بے حد تقویت ہوئی اور ملک بھر میں
مقبول ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں ہندستان کی دستوری اساس کا مشورہ دینے کے لئے سر جان سائمن کی
صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس کے ارکان میں ایک بھی ہندستانی نہیں تھا۔ ایک اہم
مشاورتی اور تفتیشی کمیشن میں ہندستانیوں کی عدم نمایندگی کو تمام جماعتوں، طبقوں، فرقوں اور
ملتوں نے ذلت محسوس کی اور جنھوں نے اس کمیشن سے اشتراک عمل کیا، انھیں بھی ناگوار گذر رہا تھا۔
اسی قسم کا ناگوارا اور عام طور پر از حد ناپسندیدہ طریق عمل حیدرآباد نے ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ
اختیار کیا تھا جب کہ لندن کی کمپنی سے حیدرآباد کی ریلیں خریدنے سے قبل ریلوے کی مالیت مشخص کرنے
کے لئے دو ریلوے انجنیر ماہروں کی خدمتیں مستعار لی تھیں اور ان کو اپنے ماہرانہ مشوروں کے لئے
فیاضانہ معاوضہ دیا تھا۔ حیدرآبادیوں کو یہ بات سخت ناگوار گذری تھی کہ کروڑوں روپے کی مالیت
حاصل کرتے وقت، قیمت کا تعین اور حکومت کو مشورہ وہی دے رہے ہیں جو کتنے ہی بڑے ماہر سہی
مقامی حالات اور قیمتوں سے ناواقف یا کم واقف تھے اور جن کی ہمدردی انگریزوں کے موافق

اور جن کے غیر شعوری تعصب سے حیدرآباد کو نقصان ہونے کا سخت اندیشہ تھا! یہ بات بھی رائے عامہ اور سنجیدہ طبقوں کی فہم عامہ کو کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی کہ ایک طرف محکمہ انجینیری کے مستعد عہدہ داروں کی مہارت کی تعریفیں کی جاتی تھیں اور دوسری طرف ریلوے کے خریدنے کے وقت ان کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔ بہرحال یہ اور اسی قسم کے موقعوں پر لوگوں کو ہندستانیوں کی عدم موجودگی سخت ناگوار گذرتی تھی اور وہ اس بات کو بری طرح محسوس کرتے تھے کہ ملک ہمارا، دولت و جائداد ہماری، مگر قبضہ اور تصرف دوسروں کا! اور شان حکومت بھی نیم نادرشاہی جس میں ہمارا عمل دخل تو درکنار، مشاورتی تجویزیں پیش کرنے کا بھی حق نہیں! ٹیکس ہم دیں، روپیہ ہم ادا کریں مگر بڑے بڑے تنخواہ پانے والے افسر سب کے سب انگریز ہوں! محنت و مشقت ہم کریں، حکومت جتانے کے لئے فرنگی ہی فرنگی ہوں، جنھیں نہ ہم سے غرض اور نہ ہماری تہذیب سے کسی قسم کی ہمدردی! یہ خیال پھیلتا گیا کہ ہمارے ملک میں کروڑوں لوگ ہیں، ان میں لاکھوں پڑھے لکھے ہیں، ہزاروں عالم اور ماہر ہیں، یا کسی قدر کوشش سے بن سکتے ہیں، مگر پھر بھی بڑی خدمتوں پر یا اہم خدمتوں پر ان کا تقرر نہیں کیا جاتا! کیا کروڑوں میں ایک بھی اس قابل نہیں کہ کسی سررشتے یا محکمے یا تعلقے کی تنظیم و نگرانی کر سکے؟!

پبلک کے تقاضوں، مختلف اداروں کے مطالبوں اور ایک منظم جماعت کے پُراثر ہنگاموں سے مجبور ہو کر حکومت نے ہندیاوے کے اصول کو مان لیا ہے اور بڑھتے ہوئے قومی شعور اور معیار ایثار کے مطابق مرکزی اور صوبائی حکومتیں مختلف خدمتیں ہندستانیوں کے لئے مختص کر رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مطالبے کرنے والے یا ان مطالبوں کی خاطر قربانیاں کرنے والے اور ہیں اور ان کے طفیل سے خدمتیں پانے والے اور! قربانیاں ایک کرے، عہدے اور ترقیاں دوسروں کو ملیں! بوتا کوئی ہے، کاٹتا کوئی ہے! اس کا بھی نام دنیا ہے۔ غرض بڑھتی ہوئی تعداد اور تناسب سے ہندستانیوں کا تقرر ہو رہا ہے اور مختلف سرکاری خدمتیں ہندیائی جا رہی ہیں۔

ہند یانے کی ایک حقیقی مثال

۱۹۳۰ء میں سرکاری ریلوں کی یورپی عہدہ داروں کی تعداد ۴،۷۷۳ تھی مگر ۱۹۳۸ء میں سرکاری ریلوں کے یورپی عہدہ داروں کی تعداد ۲،۵۰۸ ہوگئی تھی، گویا اس مدت میں جتنی جائیدادیں خالی ہوئی تھیں ان میں سے زیادہ تر جائیدادوں پر ہندستانیوں کا تقرر ہوا تھا۔ اسی کو ہند یانا کہتے ہیں۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے چونکہ کئی انگریزوں کو اہم تر اور زیادہ بھروسے کی خدمتیں تفویض کی گئی ہیں، لہذا ان کی بجائے بہت سے ہندستانیوں کا تقرر ہوا ہو تو کچھ عجب نہیں۔

سرکاری ریلوں میں عہدہ داروں کے فرقہ واری نیابت یعنے Communal Representation

اعداد سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان میں کئی عہدے ہندستانیوں کو ملے مگر کن ہندستانیوں کو یہ عہدے ملے؟ ہندؤں کو؟ عیسائیوں کو؟ مسلمانوں کو؟ سکھوں کو؟ اور ہندؤں میں بھی برہمنوں کو یا ہریجنوں کو؟

ہمارا ملک محکوم ملک ہی نہیں بلکہ فرقہ واریت میں بتلا ملک ہے! ہمیں صرف اس حقیقت سے تشفی نہیں ہوتی کہ ہمارے اپنے ملک کے انتظام میں اپنا ہی بڑھتا ہوا عمل دخل ہو، بلکہ آبادی کی مختلف جماعتوں خاص کر فرقوں میں سب کا حصہ ہو، اور یہ حصہ متعلقہ فرقے کی تعداد کے تناسب سے ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی انتظامی سررشتے میں بھی یہ ناممکن ہے کہ عہدوں کی تقسیم اور ترقیوں میں محض فرقہ واری نمایندگی کے اصول پر عمل ہو مگر فرقہ واری نمایندگی کو یک لخت نظرانداز کرنا یا کسی خاص فرقے یا جماعت ہی سے زیادہ تر ہندستانیوں کا انتخاب کرنا، بقیہ فرقوں یا جماعتوں کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے انتظام میں سب کا حصہ ہو، ہندؤں کا اور پارسیوں کا، عیسائیوں کا اور مسلمانوں کا، سکھوں کا اور ہریجنوں کا اور ہر ایک کو حصہ اس کی تعداد کے مطابق یا ہم آہنگ ملے! اسی طریق کو فرقہ واری نیابت یعنے Communal Representation کہتے ہیں۔

فرقہ واری نیابت کی دو حقیقی مثالیں لیجئے

سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں سرکاری ریلوں کی مختلف خدمتوں اور عہدوں پر ۱۴،۳۹۸ ہندستانی عیسائی تھے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء تک ان کی تعداد میں ۳،۶۴۳ کا اضافہ ہوا اور ہندستانی عیسائیوں کی کُل تعداد جو سرکاری ریلوں سے براہ راست مستفید ہورہی تھی ۱۸،۰۴۱ ہوگئی۔[1]

سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء میں سرکاری ریلوں کی مختلف خدمتوں اور بعض عہدوں پر ۲۷،۹۰۵ مسلمان مامور تھے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء تک ان کی تعداد میں ۵،۱۴۵ کی کمی ہوئی۔ مسلمانوں کی یہ تعداد اور بھی کم ہوتی اگر ریلوں کو بعض علاقوں میں معمولی اور ادنےٰ خدمتوں پر مسلمان ہی مسلمان بھرتی کرنے کی مجبوری نہ ہوتی۔ مثلاً سرحدی صوبے میں، ریلوے کلرک، دفتری، چپراسی، پٹریاں بدلنے والے، پٹریاں درست کرنے والے، چوکی دار وغیرہ زیادہ تر مسلمان نہ ہونگے تو کیا عیسائی ہونگے؟ مگر جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے، مثلاً متوسط صوبے میں وہاں ان کو نظرانداز کردیا جاسکتا ہے اور حقیقت میں نظرانداز کیا بھی جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں کے مسلمانوں کی عام شکایت ہے جس صوبے میں پانچ فی صدی مسلمان ہوں سرکاری ریلوے میں نوکریاں حاصل کرنے والوں کی تعداد ایک فی صد سے کم ہے! چونکہ علاقہ واری یا صوبائی اعداد علٰحدہ علٰحدہ نہیں دئے جاتے اس لئے سرکاری اعداد کے حوالے سے سنی سنائی باتوں کی تصدیق کرنا ممکن نہیں مگر مختلف سمتوں، طبقوں اور فرقوں کی مسلسل اور دیرینہ شکایتوں سے یہ اندازہ لگانا غلط نہیں کہ شاکیوں کے گلے بیجا نہیں ہیں۔ اور جو نیکی یا انصاف ریلوے مجبوراً کرتی ہے وہ بھی نہ ہوتی تو مسلمانوں اور ہریجنوں کے حق میں ناانصافی اور بھی زیادہ ہوتی۔ کیونکہ خود سرکاری اعداد سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ سرکاری

---

[1] الجھاؤ کے خیال سے میں نے مختلف اعداد کے ماخذوں کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ صرف مثال کے طور پر یہاں حوالہ دیتا ہوں۔ یہ اعداد Statistical abstract for Br. India کی اٹھارویں اشاعت، مطبوعہ گورمنٹ پریس، کلکتہ سنہ ۱۹۴۲ء کے صفحہ نمبر ۶۴۴ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

ریلوں میں جو ہندیاوی طریق Indianizing process جاری ہے،
اس میں سراسرنا انصافی اور مصلحت کار فرما ہیں کیونکہ جس رفتار اور تناسب سے خدمتیں ہندیائی
جارہی ہیں، اسی رفتار یا تناسب سے ہندستان کے سب فرقے اور جماعتیں یا علاقے اور طبقے،
نسلیں اور ملتیں مستفید نہیں ہورہی ہیں۔

تفصیلی طور پر اعداد و شمار کا تقابل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریلوے کے اعلیٰ یورپین
عہدہ دار سب سے زیادہ ہندستانی نژاد یورپی لوگوں یعنے انگلو انڈین یا ہندستانی فرنگیوں پر،
اس کے بعد ہندستانی عیسائیوں پر اور آخر میں پارسیوں اور برہمنوں پر مہربانیاں کرتے ہیں
اور زیادہ تر ان ہی میں فیاضی سے خدمتیں تقسیم کرتے ہیں اور سب سے زیادہ گھاٹے میں
سکھ، مسلمان اور "نیچ" تصور کئے جانے والے اور "اچھوت" کہلانے والے ہندو ہوتے ہیں جنھیں
گاندھی جی نے ہریجن کا معزز نام بخشا ہے۔ جب مسلمانوں اور سکھوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی
تعداد مجموعی طور پر بڑھ رہی ہے، پھر بھی جو نوکریاں سرکاری ریلوں میں خالی ہوتی ہیں، ان
میں سے انھیں بہت کم ملتی ہیں تو یقینی طور پر انھیں بہت برا معلوم ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ
حکومت یہ اصول اختیار کرے کہ جہاں کہیں ہوسکے اور جہاں تک ہوسکے فرقہ واری نیابت کا
انتظام کیا جائے۔

ہندستان میں گناوے کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہورہی ہے اس کی ایک وجہ یہی فرقہ واری
نیابت ہے جسے قانون ساز جماعتوں کی حد تک تسلیم کر لیا گیا ہے۔ قانون بنانے والی جتنی مجلسیں
ہیں ان کے لئے چناؤ فرقہ واری طریق پر ہوتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اور فرنگی
سب الگ الگ اپنے نمایندوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ کہیں کہیں علاقہ واری انتخاب بھی ہوتا ہے
مگر عام طور پر فرقہ واری نمایندگی ہوتی ہے اور زیادہ تر مذہب و ملت کے ماننے والوں کی تعداد
کی مناسبت سے قانون بنانے والی مجلسوں میں بیٹھکیں معین ہوتی ہیں، زائد نیابت یعنے
Weightage بھی بعض فرقوں کو حاصل ہے مگر یہ زائد نیابت بھی دوسروں
کی شکایتوں کا باعث بنتی ہے لہذا ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی خواہش ہے کہ جتنی ان کی تعداد

بڑھیگی، اسی کی مناسبت سے وہ قانون ساز مجلسوں میں اپنے نمایندوں کے اضافہ کا مطالبہ کرسکیں گے
اور آخرکار اپنے مطالبوں میں تمام تر یا جزوی طور پر کامیاب ہونگے اور جس قدر زیادہ ان کے
نمایندے ہونگے اسی قدر زیادہ وہ توقع کرسکیں گے کہ صوبائی یا مرکزی حکومت کی تمدنی، سیاسی،
معاشی اور سماجی پالیسی پر ان کا اثر پڑے گا۔ پھر یہ بھی کہ قانون ساز مجلسوں میں جتنے زیادہ کسی
مذہب و ملت کے نمایندے ہوں گے وہ اپنے رسوخ اور اثر کی وجہ سے اپنے ہم فرقہ وکیلوں،
ٹھیکہ داروں، ڈاکٹروں، تاجروں، سرمایہ داروں، فن کار ماہروں وغیرہ کو فایدہ پہنچا
سکیں گے۔ ان ہی وجہوں کے تحت کئی لوگوں نے گذشتہ گنا وے میں اپنی اصلی تعداد بڑھا کر
لکھوادی۔ اور اپنے حقیقی یا منصورہ مفاد کے تحت باضابطہ طور پر غلط بیانی کی اور منظم پروپگنڈے
کے ذریعے غلط بیانی کرنے کا مشورہ دیا! اخباروں میں، رسالوں میں، تقریروں میں، انتہا یہ کہ
پوسٹروں کے ذریعہ علانیہ مشورہ دیا گیا کہ "اپنی مادری زبان اردو لکھاؤ!" "تم ہندو ہو!
تمہارا کرتویہ ہے کہ دھرم کا پالن کرو اور اپنی ماتر بھاشا ــ ہندی لکھواؤ!" بعضوں نے
مشورہ دیا کہ اپنے آپ کو صرف مسلمان لکھواؤ! بعضوں نے کہا نہیں اپنا اصلی فرقہ لکھواؤ ورنہ
تمہاری انفرادیت فنا ہو جائے گی! کسی نے کہا اپنے آپ کو سکھ بتلاؤ، کسی نے کہا نہیں، ہندو
لکھو، اور عیسائیوں کے سوا سب نے اشاروں میں یا علانیہ یہ کہا کہ اپنی تعداد بڑھاؤ۔
ایک صاحب نے مجھ سے تجربہ بیان کیا کہ انھوں نے گھر والوں کی تعداد سات کی بجائے
سترہ بتائی تھی؛ شمار ندہ Enumerator انہیں کا ہم مذہب تھا
اس نے انہیں رائے دی کہ "سترہ تو ہیں ہی دو اور لکھوا دیجے!" غرض سات کے انیس ہو گئے!
میں جانتا ہوں کہ ہر جگہ ایسا اندھیر نہیں ہوا مگر پھر بھی یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوؤں
اور مسلمانوں نے اپنی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھائی ضرور ہے۔ کیونکہ اپنی دانست میں وہ سمجھتے تھے کہ
انھوں نے اپنی تعداد بڑھا کر اپنے دین اور ہم مذہبوں کی بڑی خدمت کی ہے۔

غرض فرقہ داری نیابت اور ہندیانے کی پالیسی کی وجہ سے ہندستان میں گنا وے کو
غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی۔ ایسی اہمیت جس کی نظیر انگلستان یا امریکہ میں کہیں نہیں ملتی

اور جب تک ہمارے ملک میں فرقہ واریت کا بول بالا رہے گا، یہ اہمیت باقی رہے گی۔

اس غیر معمولی اہمیت کے علاوہ بھی گنادوں کی عام اہمیت ہر ملک میں، خاص کر ترقی پذیر ملکوں میں، مانی ہوئی بات ہے، کیوں کہ گنادوں سے ہمیں حقیقت کا علم ہوتا ہے اور خاص کر جب تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو اعداد کی روشنی میں ہم نہ صرف اپنی تہذیب و تمدن کی اساس معلوم کر سکتے ہیں بلکہ مستقبل کے لئے نظام عمل بنانے میں مدد لے سکتے ہیں!

سب سے پہلے تو ہم دنیا کے مختلف حصوں کے بڑے چھوٹے ملکوں اور ہندستان کے صوبوں اور بعض ریاستوں کے تعدادی حوالے دیتے ہیں، جن پر ایک نظر ڈالنے سے ہمیں آبادی کے چند اساسی اعداد کی سرسری واقفیت ہو جائے اور شماریات آبادی کی اضافی نوعیت معلوم ہو جائے کیونکہ ایک ملک جس کا شمار ایک لحاظ سے سب سے آخر ہوتا ہے دوسرے لحاظ سے سب سے اول ہوتا ہے، بڑا منجھلا، اور منجھلا چھوٹا اور چھوٹا بڑا، اول آخر یا آخر اوّل ہو جاتا ہے!

آبادی کا مسئلہ

چند اساسی اعداد

ملکوں، ریاستوں، صوبوں کے رقبے، آبادیاں اور گنجانی

آبادی اور شماریات کی اساس معلوم کرنے کے لئے آیندہ تین جدولوں میں ۲۵ مختلف علاقوں کے نام اور ان کے رقبے، کُل آبادی اور ہر چوکور میل پر آبادی کی تعداد وغیرہ دی گئی ہے۔ پہلی جدول میں ملکوں، صوبوں اور ریاستوں کی ترتیب رقبہ واری اہمیت کے لحاظ سے کی گئی ہے یعنے جو ملک وسعت میں سب سے بڑا تھا اس کو سب سے پہلے اور جو سب سے کم تھا

اسے سب سے آخر میں رکھا ہے ۔

دوسری جدول میں اُن ہی ۲ ۵ علاقوں کی ترتیب آبادی کی کل تعداد کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنے جہاں سب سے زیادہ آبادی تھی اس ملک کا نام سب سے پہلے اور جہاں سب سے کم آبادی تھی اس کا نام سب سے آخر میں رکھا گیا۔

تیسری جدول میں جن ملکوں کے اعداد پہلی اور دوسری جدولوں میں دئے گئے تھے ان ہی کی ترتیب گنجانی کے اعتبار سے کی گئی ہے ۔ گنجانی سے مراد یہ ہے کہ اوسطاً ہر چوکور میل کے رقبہ پر کتنے لوگ آباد ہیں ۔ ملکوں کی گنجانیت کا لحاظ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ رقبہ اور آبادی میں کیا تناسبی بندھن ہے ۔

ان تینوں جدولوں پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہوگا کہ جو ملک آبادی کی کل تعداد کے لحاظ سے پہلے اور دوسرے ہیں، وہ بہت زیادہ گنجان طور پر آباد نہیں اور جو ملک وسعت میں سب سے بڑے ہیں وہ گنجانیت کے اعتبار سے کم ہیں ۔ مثلاً ہندستان اور چین سب سے زیادہ آبادی والے ملکوں کی گنجانی متوسط ہے اور کنیڈا جو وسعت کے لحاظ سے بڑا ہے گنجانیت کے اعتبار تقریباً سب سے آخر ہے!

ارقبہ واری ترتیب

نام	چوکور میل
۱ کینیڈا	۳۴،۶۶،۵۵۶
۲ بریزل	۳۲،۷۵،۵۱۰
۳ متحدہ امریکی ریاستیں	۲۹،۷۷،۱۲۸
۴ آسٹریلیا	۲۹،۴۴،۵۸۱
۵ چین	۲۹،۰۳،۴۷۵
۶ ہندستان	۱۵،۸۱،۴۱۰
۷ آرجنٹائین	۱۰،۷۹،۹۶۵
۸ ایران	۶،۲۸،۰۰۰
۹ اتحاد دکنی افریقہ	۴،۷۲،۵۵۰
۱۰ مہاجاپان	۳،۷۰،۷۷۰
۱۱ افغانستان	۲،۵۰،۰۰۰
۱۲ مہاجرمنی	۲،۲۵،۱۹۹
۱۳ فرانس	۲،۱۲،۶۵۹
۱۴ سپین	۱،۹۶،۶۰۷
۱۵ جرمنی	۱،۸۱،۶۳۰
۱۶ سویڈن	۱،۷۳،۳۴۱
۱۷ حجاز	۱،۵۰،۰۰۰
۱۸ جاپان	۱،۴۷،۰۰۰
۱۹ مدراس	۱،۲۶،۱۶۶
۲۰ ناروے	۱،۲۴،۵۵۶
۲۱ اٹلی	۱،۱۹،۷۶۴
۲۲ عراق	۱،۱۷،۰۰۰
۲۳ متحدہ صوبے	۱،۰۶،۲۴۷
۲۴ نیوزی لینڈ	۱،۰۳،۴۴۰
۲۵ پنجاب	۱ ۹۹،۰۸۹
۲۶ متوسط صوبے	۹۸،۵۷۵
۲۷ حیدرآباد	۸۲،۳۱۳
۲۸ کشمیر	۸۲،۲۵۸
۲۹ بنگال	۷۷،۴۴۲
۳۰ بمبئی	۷۶،۴۴۳
۳۱ بہار	۶۹،۷۴۵
۳۲ بلوچستان	۵۴،۴۵۶
۳۳ انگلستان	۵۰،۸۷۴
۳۴ سندھ	۴۸،۱۳۶
۳۵ آسام	۴۵،۹۵۱
۳۶ پرتگال	۳۵،۴۹۰
۳۷ اڑیسہ	۳۲،۱۹۲
۳۸ سکاٹ لینڈ	۳۰،۴۰۵
۳۹ میسور	۲۹،۴۵۸
۴۰ گوالیر	۲۶،۰۰۸
۴۱ سوئٹزرلینڈ	۱۵،۹۴۴
۴۲ جیپور	۱۵،۶۱۰
۴۳ سرحدی صوبہ	۱۴،۲۶۳
۴۴ ہالینڈ	۱۲،۷۱۲
۴۵ بلجیم	۱۱،۷۷۵
۴۶ اندفار	۹،۹۳۴
۴۷ بروڈا	۸،۲۳۶
۴۸ ٹراونکور	۷،۶۶۲
۴۹ ویلز	۷،۴۶۶
۵۰ بھوپال	۶،۹۲۱
۵۱ ٹونک	۲،۵۴۳
۵۲ رامپور	۸۹۶

۲۔ آبادی کی تعداد کے لحاظ سے ترتیب

(تمام اعداد سنہ ۱۹۳۶ء-۴۱ کے درمیانی مدت کے ہیں)

نمبر	نام	آبادی
۱	چین	۴۲،۲۷،۰۰،۰۰۰
۲	ہندستان	۳۸،۸۹،۰۰،۰۰۰
۳	متحدہ امریکی ریاستیں	۱۳،۱۶،۶۹،۰۰۰
۴	مہاجاپان	۹،۷۶،۰۰،۰۰۰
۵	مہاجرمنی	۷،۹۵،۰۰،۰۰۰
۶	جرمنی	۶،۹۶،۰۰،۰۰۰
۷	جاپان	۶،۹۲،۰۰،۰۰۰
۸	بنگال	۶،۰۳،۰۰،۰۰۰
۹	متحدہ صوبے	۵،۵۰،۰۰،۰۰۰
۱۰	مدراس	۴،۹۳،۰۰،۰۰۰
۱۱	اٹلی	۴،۲۹،۰۰،۰۰۰
۱۲	فرانس	۴،۱۹،۰۰،۰۰۰
۱۳	برازیل	۴،۱۳،۰۰،۰۰۰
۱۴	انگلستان	۳،۷۷،۰۰،۰۰۰
۱۵	بہار	۳،۶۳،۰۰،۰۰۰
۱۶	پنجاب	۲،۸۴،۰۰،۰۰۰
۱۷	سپین	۲،۵۸،۰۰،۰۰۰
۱۸	بمبئی	۲،۰۸،۰۰،۰۰۰
۱۹	ایران	۱،۸۰،۰۰،۰۰۰
۲۰	متوسط صوبے	۱،۶۸،۰۰،۰۰۰
۲۱	حیدرآباد	۱،۶۳،۰۰،۰۰۰
۲۲	آرجنٹائین	۱،۳۳،۰۰،۰۰۰
۲۳	افغانستان	۱،۲۰،۰۰،۰۰۰
۲۴	کینیڈا	۱،۱۴،۰۰،۰۰۰
۲۵	آسام	۱،۰۲،۰۰،۰۰۰
۲۶	اتحاد دکنی افریقہ	۹۵،۸۹،۰۰۰
۲۷	ہالینڈ	۸۷،۲۸،۰۰۰
۲۸	اڑیسہ	۸۷،۲۸،۰۰۰
۲۹	بلجیم	۸۳،۲۸،۰۰۰
۳۰	مڈیسکر	۷۳،۳۹،۰۰۰
۳۱	آسٹریلیا	۶۹،۹۷،۰۰۰
۳۲	پرتگال	۶۸،۲۵،۰۰۰
۳۳	سویڈن	۶۳،۷۰،۰۰۰
۳۴	ٹراونکور	۶۰،۷۰،۰۰۰
۳۵	سکاٹ لینڈ	۴۸،۴۲،۰۰۰
۳۶	سندھ	۴۵،۳۵،۰۰۰
۳۷	سوئٹزرلینڈ	۴۲،۶۰،۰۰۰
۳۸	گوالیئر	۴۰،۳۶،۰۰۰
۳۹	کشمیر	۴۰،۲۱،۰۰۰
۴۰	عراق	۳۵،۰۰،۰۰۰
۴۱	جیپور	۳۰،۴۸،۰۰۰
۴۲	سرحدی صوبہ	۳۰،۳۸،۰۰۰
۴۳	بڑودا	۲۸،۵۵،۰۰۰
۴۴	ناروے	۲۸،۱۴،۰۰۰
۴۵	ویلز	۲۱،۵۸،۰۰۰
۴۶	نیوزی لینڈ	۱۵،۷۳،۰۰۰
۴۷	اندور	۱۵،۱۳،۰۰۰
۴۸	حجاز	۱۵،۰۰،۰۰۰
۴۹	بھوپال	۷،۸۵،۰۰۰
۵۰	بلوچستان	۵،۰۱،۰۰۰
۵۱	رامپور	۴،۷۷،۰۰۰
۵۲	ٹونک	۳،۵۳،۰۰۰

۳۔ ہر چوکور میل کی آبادیت کے لحاظ سے ترتیب

۱ ٹراونکور	۷۹۲
۲ بنگال	۷۷۹
۳ بلجیم	۷۱۲
۴ بالینڈ	۶۸۶
۵ انگلستان	۶۸۵
۶ رامپور	۵۲۸
۷ بہار	۵۲۱
۸ متحدہ صوبے	۵۱۸
۹ جاپان	۴۶۹
۱۰ مدراس	۳۹۱
۱۱ جرمنی	۳۸۲
۱۲ مہا جاپان	۳۷۵
۱۳ اٹلی	۳۵۹
۱۴ بروڈا	۳۴۹
۱۵ مہا جرمنی	۳۰۸
۱۶ ویلز	۲۸۸
۱۷ پنجاب	۲۸۷
۱۸ بمبئی	۲۷۲
۱۹ اڑیسہ	۲۷۱
۲۰ سوئٹزرلینڈ	۲۵۵
۲۱ میسور	۲۴۹
۲۲ ہندستان	۲۴۶
۲۳ سرحدی صوبہ	۲۱۳
۲۴ حیدرآباد	۱۹۸
۲۵ فرانس	۱۹۷
۲۶ جیپور	۱۹۵
۲۷ پرتگال	۱۹۲
۲۸ آسام	۱۸۶
۲۹ متوسط صوبے	۱۷۰
۳۰ گوالئیر	۱۵۴
۳۱ اندور	۱۵۲
۳۲ چین	۱۴۵
۳۳ ٹونک	۱۳۹
۳۴ سکاٹ لینڈ	۱۳۳
۳۵ سپین	۱۳۱
۳۶ بھوپال	۱۱۳
۳۷ سندھ	۹۴
۳۸ کشمیر	۴۹
۳۹ افغانستان	۴۸
۴۰ متحدہ امریکی ریاستیں	۴۴
۴۱ سویڈن	۴۰
۴۲ عراق	۳۰
۴۳ ناروے	۲۲
۴۴ اتحادۂ دکنی افریقہ	۲۰
۴۵ ایران	۱۹
۴۶ نیوزی لینڈ	۱۵
۴۷ برزیل	۱۲
۴۸ ارجنٹائین	۱۲
۴۹ حجاز	۱۰
۵۰ بلوچستان	۹
۵۱ کینیڈا	۳
۵۲ آسٹریلیا	۲

آبادی کی گنجانی

ہندستان کا مقابلہ یورپی ملکوں سے کرنا ٹھیک نہیں کیوں کہ ہندستان جغرافی اور معاشی اعتبار سے آدھا براعظم ہے۔ ہندستان کے صوبوں اور بعض بڑی بڑی دیسی ریاستوں کا مقابلہ یورپی ملکوں سے کرنا ٹھیک ہوگا کیوں کہ یہ ان کے ہم پلہ ہیں۔

اس جدول میں ہم ہندستان کی گنجانی کا مطالعہ کریں گے تاکہ معلوم ہو کہ بڑے بڑے علاقوں کے ملکوں میں آبادی کتنی ہے اور ہندستان میں کتنی۔

ملک کا نام	جس سال کے اعداد ہیں	رقبہ (چوکور میلوں میں)	کل آبادی	گنجانی (ہر چوکور میل پر لوگوں کی تعداد)
آسٹریلیا	سنہ ۱۹۳۹ء	۲۹،۷۴،۰۰۰	۷۰،۰۰،۰۰۰	۲
کینیڈا	سنہ ۱۹۴۱ء	۳۴،۶۶،۰۰۰	۱،۱۴،۰۰،۰۰۰	۳
آرجنٹائن	سنہ ۱۹۴۱ء	۱۰،۸۰،۰۰۰	۱،۳۳،۰۰،۰۰۰	۱۲
متحدہ امریکی ریاستیں	سنہ ۱۹۴۰ء	۲۹،۷۷،۰۰۰	۱۳،۱۶،۰۰،۰۰۰	۴۴
چین	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۹،۰۳،۰۰۰	۴۲،۲۷،۰۰،۰۰۰	۱۴۸
ہندستان	سنہ ۱۹۴۱ء	۱۵،۸۱،۰۰۰	۳۸،۸۹،۰۰،۰۰۰	۲۴۶

یہ اعداد شاہد ہیں کہ بڑے بڑے علاقوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ہندستان بہت کافی آباد ہے اور جو لوگ ہندستان کی "قلت آبادی" کو ظاہر کرنے کے لئے ہندستان کا مقابلہ بلجیم، ہالینڈ یا انگلستان سے کرتے ہیں وہ کیسی دھاندلی کرتے ہیں کیونکہ رقبائی وسعت کے اعتبار سے انگلستان ریاست حیدرآباد کا دو تہائی، صوبۂ آسام سے بھی چھوٹا اور صوبۂ سندھ سے کچھ بڑا ہے۔ کُل کو جزو کے مقابلے میں برابری سے پیش کرنا، اساسی بھول ہے۔

دنیا کی سطح زمین کا مجموعی رقبہ ۵ ½ کروڑ چوکور میل ہے اور دنیا کی مجموعی آبادی کا اندازہ

دو ارب سے زیادہ تقریباً ۲۱۸ کروڑ کیا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ مجموعی اعتبار سے دنیا کی گنجانی ۴۰ افراد فی چوکور میل ہے اور ہندستان کی گنجانی تقریباً ۲۵۰!

جنوبی امریکہ کا ایک اور بڑا ملک برازیل ہے جس کا رقبہ ہندستان کے رقبے سے دونا ہے مگر وہاں کی آبادی صرف ۴،۱۶،۰۰،۰۰۰ ہے۔ اس لحاظ سے وہاں کی گنجانی ۱۲ ہے اور ہندستان کی ۲۴۶۔ ان اعداد سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ہماری آبادی کس قدر گھنی ہے! اور یہ غور طلب بات ہے کہ جہاں آبادی پہلے ہی سے کافی گھنی ہوگی وہاں آبادی کے بڑھنے اور پھیلنے کی گنجائش کہاں سے آئے گی؟!

متحدہ امریکی ریاستوں کے صنعتی، کاروباری، تجارتی، زراعتی، فنی اور پیشہ وری بلند معیار کو پیش نظر رکھئے اور خیال کیجئے کہ ایسے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک میں تو ہر چوکور میل پر ۴۴ لوگ آباد ہیں مگر ہندستان میں محکومیت، غفلت اور جہالت کے ہوتے ہوئے ۲۴۶۔

ان اعداد سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتے ہیں کہ امریکہ کے تمام ملکوں میں نیز آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں آبادی کے بڑھنے کی بہت گنجائش ہے؛ اس کے برعکس یورپ اور ایشیا کے اکثر ملک "لب ریز" یا "بھرپور" نہ سہی تو اپنی موجودہ سکت سے زیادہ آباد ہو چکے ہیں۔ اکثر ایشیائی ملکوں کی طرح ہندستان بھی اپنی خام کاری، محکومیت اور محدود ذرائع آمدنی اور زیادہ تعداد آبادی کی وجہ سے اضافی طور پر کثیر الآباد ہے۔ ہندستان کی اضافی کثرت آبادی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کیوں کہ ہمارے موجودہ ذرائع معاش، پیداوار، معمولی بلکہ ادنےٰ معیار معیشت کے لئے موجودہ آبادی بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہندستان نہایت سست رفتار پر ترقی کر رہا ہے اور اس کی عظیم ترین اکثریت صدیوں پہلے کی طرح کمل پوش، فاقہ کش مصیبت زدہ، غافل اور ان پڑھ ہے۔

ہندستان کے مختلف حصوں میں آبادی کی گنجانی

ہندستان نہ صرف مجموعی حیثیت سے کافی آباد ہے بلکہ آبادی کی غیر موافقانہ تقسیم کی وجہ سے بعض حصے بہت زیادہ گنجان طور پر آباد ہیں۔ مختلف صوبوں اور ریاستوں میں آبادی کی گنجانی دکھانے کے لئے ہم ان صوبوں اور ریاستوں کی رقبہ واری اور کل تعدادی جدولیں پیش کرتے ہیں تاکہ ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے کہ کون کون سے صوبے بڑے یا چھوٹے ہیں ؛ کہاں کہاں آبادی سب سے زیادہ یا سب سے کم ہے۔

(۱) ہندستانی صوبوں اور بعض ریاستوں کی رقبہ واری ترتیب

صوبے یا ریاست کا نام	رقبہ ، چوکور میلوں میں	تقابلی کیفیت
مدراس	۱،۲۶،۱۶۶	مدراس کے ہم وسیع ملک جاپان ، ناروے اور اٹلی ہیں
متحدہ صوبے	۱،۰۶،۲۴۷	اس کا رقبہ نیوزی لینڈ کے برابر ہے۔
پنجاب	۹۹،۰۸۹	آدھے جرمنی کے برابر۔
متوسط صوبے	۹۸،۵۷۸	رقبہ آدھے جرمنی کے برابر ہے۔ مگر پیداوار؟
حیدرآباد ریاست	۸۲،۳۱۳	انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبہ کے برابر۔

صوبے یا ریاست کا نام	رقبہ، چو کور میلوں میں	تقابلی کیفیت
کشمیر ریاست	۸۲،۳۱۳	انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبہ کے برابر۔
بنگال	۷۷،۴۴۲	آدھے جاپان کے برابر۔
بمبئی	۷۶،۴۴۳	جاپان کے آدھے رقبے کے برابر۔
بہار	۶۹،۷۵۴	انگلستان اور ویلز کے رقبوں سے زیادہ۔
سندھ	۴۸،۱۳۶	انگلستان سے کچھ کم، تقریباً برابر!
آسام	۴۵،۹۵۱	ہالینڈ، بلجیم اور سوئٹزرلینڈ سے بڑا!
اڑیسہ	۳۲،۱۹۲	سکاٹ لینڈ کے برابر۔
میسور ریاست	۲۹،۴۵۸	سکاٹ لینڈ سے کچھ کم۔
گوالیر "	۲۶،۰۰۸	سکاٹ لینڈ سے کچھ کم
جیپور ریاست	۱۵،۶۱۰	اس ریاست کا ہم وسیع ملک سوئٹزرلینڈ ہے۔
سرحدی صوبہ	۱۴،۲۶۳	ہالینڈ سے کچھ بڑا۔
اندور ریاست	۹،۹۳۴	اس کا رقبہ بلجیم سے کم ہے۔
بروڈا	۸،۲۳۶	اس کا رقبہ بلجیم سے کم ہے۔
ٹراونکور	۷،۶۶۲	ٹراونکور کا ہم وسیع ملک ویلز ہے۔

یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ صوبائی رقبوں میں صرف ان ہی علاقوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو براہ راست انگریزوں کے ماتحت ہے۔ مثلاً پنجاب کا رقبہ ۹۹ ہزار واضح کیا گیا ہے، مگر پنجاب ہی میں بعض دیسی ریاستیں ہیں، جہاں کی آبادی، تہذیب و تمدن سب ہی بقیہ پنجاب کی طرح ہے، جنھیں رقبہ واری وسعت میں ملحوظ نہیں رکھا گیا کیونکہ یہ علاقے دیسی راجاؤں کے ماتحت اور بالواسطہ انگریزوں کے تحت ہیں۔ پنجاب کے صوبائی اعداد میں دیسی ریاستوں کے اعداد کو شامل نہیں کیا جانا چاہئے اور سنجیدہ علمی کتابوں میں یہ فرق ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ اگر دیسی ریاستوں کا رقبہ شامل کرلیا جائے تو کل پنجاب کا رقبہ ۱،۳۷،۲۳۵

کل سرحد کا ۳۹،۲۴۹ اور اڑیسہ کا ۵۰،۳۴۹ ہوتا ہے۔

(ب) ہندستان کے صوبوں اور بعض ریاستوں کی ترتیب

(آبادی کی تعداد کے لحاظ سے)

ان ہی صوبوں اور ریاستوں کی ترتیب کل آبادی کے لحاظ سے یہ ہے۔

		تقابلی کیفیت
کُل بنگال	۶،۲۴،۵۰،۰۰۰	جاپان کی آبادی ۷ کروڑ سے کم ہے۔
صوبۂ بنگال	۶،۰۳،۰۰،۰۰۰	〃 〃 〃 〃 〃
صوبۂ متحدہ	۵،۵۰،۰۰،۰۰۰	صرف دو آبے کی آبادی انگلستان، سکاٹلینڈ اور اور ویلز سے زیادہ ہے۔
کُل مدراس	۵،۶۶،۰۰،۰۰۰	فرانسیسیوں کی تعداد سے ڈیڑھ کروڑ زیادہ۔
صوبۂ مدراس	۴،۹۲،۰۰،۰۰۰	اٹلی، فرانس یا برزیل کی آبادی سے ۱/۴ کروڑ زیادہ۔
بہار	۳،۶۳،۰۰،۰۰۰	انگلستان کی آبادی کے برابر۔
کُل پنجاب	۳،۴۰،۰۰،۰۰۰	〃 〃 〃 〃
پنجاب صوبہ	۲،۸۴،۰۰،۰۰۰	سپین کی آبادی سے زیادہ
بمبئی	۲،۶۸،۰۰،۰۰۰	
متوسط صوبے	۱،۶۸،۰۰،۰۰۰	ایران کی آبادی کے برابر
حیدرآباد ریاست	۱،۶۳،۰۰،۰۰۰	〃 〃 〃 〃
آسام	۱،۰۶،۰۰،۰۰۰	
اڑیسہ	۸۷،۲۸،۰۰۰	ہالینڈ کی آبادی کے برابر
میسور ریاست	۷۳،۳۹،۰۰۰	بلجیم کی آبادی سے کچھ کم

		تقابلی کیفیت
ٹراونکور ریاست	۶۰،۷۰،۰۰۰	
کُل سرحدی علاقہ	۵۴،۱۵،۰۰۰	
سندھ صوبہ	۴۵،۳۵،۰۰۰	سکاٹ لینڈ کی آبادی کے برابر
گوالئیر ریاست	۴۰،۴۶،۰۰۰	
کشمیر ریاست	۴۰،۲۱،۰۰۰	
سرحدی صوبہ	۳۰،۳۸،۰۰۰	
بروڈا ریاست	۲۸،۵۵،۰۰۰	ناروے کی آبادی کے برابر
اندور ریاست	۱۵،۱۳،۰۰۰	
کُل بلوچستان	۸،۵۷،۰۰۰	
بلوچستان	۵،۰۱،۰۰۰	

اسی جدول سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محض تعداد کے زیادہ ہونے سے کیا حاصل! بھوکے، انپڑھ، جاہل اور نا اہل لوگ کروڑوں کی تعداد میں ہوں تو بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو تعداد میں دس گنا کم مگر قابلیت، دولت مندی، کارگذاری، تنظیم، اہلیت اور تعلیم میں سو گنا بہتر ہوں۔ اگر ہماری قوم تاریخ، عمرانیات اور علم تمدن کی اس اٹل حقیقت کو محسوس کرے تو وہ اپنی تعداد بڑھانے کی بجائے (یا تبلیغ اور شدھی پر اپنی توتوں کو صرف کرنے سے قبل!) اپنے آپ کو اہل اور طاقت ور بنانے کی کوشش کرے گی اور کسی صورت میں بھی تحدید آبادی اور ضبط تولید کی مخالفت نہیں کرے گی۔

(پ) ہندوستان کے مختلف سمتوں کی گنجانی

	رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد	تقابلی کیفیت
ٹراونکور	۷۹۲	دنیا کا سب سے زیادہ گنجان آباد رقبہ

	رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد	تقابلی کیفیت
بنگال	۷۷۹	ہندستان کا سب سے زیادہ گنجان صوبہ ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ گنجان ملک بلجیم ہے، بنگال کی گنجانی اس سے زیادہ ہے۔
بہار	۵۲۱	جاپان سے زیادہ بہار کی آبادی گھنی ہے۔
متحدہ صوبے	۵۱۸	جاپان سے زیادہ آگرہ و اودہ کی آبادی گھنی ہے۔
مدراس	۳۹۱	جرمنی کے برابر گنجان آباد ہے۔ جرمنی کے ذرایع معاش کتنے زیادہ اور اس صوبے کے کتنے کم ہیں۔ یہ بھی ایک اہم سبب ہمارے افلاس کا اور پست معیار زندگی کا ہے۔
برودا	۳۴۹	یہاں کی آبادی اٹلی کے برابر گھنی ہے۔
پنجاب	۲۸۷	پنجاب، بمبئی اور اڑیسہ ویلز کے برابر گھنے آباد ہیں۔ اگر ویلز کے باشندوں کی طرح یہاں والوں کو بھی مختلف قسم کے ذرایع معاش میسر ہوتے تو یہ لوگ بھی خوش حال ہوتے۔
بمبئی	۲۷۲	
اڑیسہ	۲۷۱	
میسور	۲۴۹	میسور سوئیٹزرلینڈ کے برابر گنجان ہے۔
سرحدی صوبہ	۲۱۳	
حیدرآباد	۱۹۸	فرانس کے برابر۔
آسام	۱۸۶	گنجانی پرتگال کی طرح ہے۔
متوسط صوبے	۱۷۰	
گوالیر	۱۵۴	
سندھ	۹۴	

	رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد	تقابلی کیفیت
کشمیر	۴۹	دنیا کی سب سے زیادہ ترقی پذیر ریاست امریکہ کے برابر!
بلوچستان	۹	کینیڈا اور آسٹریلیا کی گنجانی سے تگنی! اتنا گھٹنے پر بھی اس قدر زیادہ!

اس جدول اور اس کی تقابلی کیفیت سے ہندستان کی نکبت اور مصیبت واضح ہے۔ میسور ہندستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست تو ہے مگر سوئٹزرلینڈ کے مقابلے میں میسور کی صنعت و حرفت، زراعت، تجارت، فن کاری، تعلیم دس گنی کم ہے! پھر بھی دونوں یکساں گھنے آباد ہیں۔ اگر ایک خاندان کی آمدنی دو ہزار ماہانہ ہو اور دوسرے خاندان کی صرف بیس بائیس مگر کھانے والے دونوں خاندانوں میں بیس بیس ہوں تو ظاہر ہے کہ معیار زندگی اور معیار آرام میں کتنا فرق رہے گا اور لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت، ہنرمندی اور اہلیت میں کتنا فرق نمودار ہوگا۔

جن غریب یا تنگ دست ماں باپ کو بہت بچے ہوتے ہیں وہ کبھی اپنی اولاد کو اچھی تعلیم نہیں دے سکتے اور ہونہار افراد مشق اور تربیت حاصل کرکے اپنی کارکردگی بڑھانے اور مستقبل کو سنوارنے کی بجائے کشمکش حیات میں مبتلا ہو کر خود کمانے کھانے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح ایک اچھے شہری اور ہنرمند کاریگر یا اعلےٰ صناع بننے سے محروم رہتے ہیں۔ بہتیرے متوسط الحال گھرانوں کے افراد ہیں جو محض اعلےٰ تعلیم یا فنی تعلیم نہیں حاصل کر سکنے کی وجہ سے ترقیوں سے محروم ہیں۔ اکثر بڑے بھائی بہنوں پر چھوٹے بھائی بہنوں کا بار پڑتا ہے اور ایسے وقت جب کہ خود ان میں اپنے پانو پر کھڑے رہنے کی طاقت نہیں پیدا ہوتی یہ بار ان کی زندگی کو برباد کرتا ہے۔ بچوں کو پالتے پالتے ماں باپ پریشان ہو جاتے ہیں اور جس قدر زیادہ وہ غیور اور سمجھ دار ہوتے ہیں، اسی قدر وہ اپنی مصیبت کو محسوس کرتے ہیں اور اپنے چہیتوں کی مصیبتیں دیکھ کر کڑھتے ہیں۔

ہندستان کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ کب تک کچی جھونپڑیوں میں، کچے پکے کو ٹھوں کے
مکانوں میں، کافی یا معقول غذا میسر نہیں کر سکنے والے گھرانوں میں، ناخواستہ اور بار خاطر
اولاد پیدا کرتا رہے گا؟ متوسط طبقوں کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ اپنے سے بہتر اپنی اولاد
کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا چاہتے ہیں یا خود مصیبتوں میں مبتلا رہ کر دوسروں کو
مصیبتوں میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں؟ ہر غیور اور سمجھ دار آدمی کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ
اپنے معیار آرام کو بلند تر کرنا چاہتا ہے اور اپنے چہیتوں کے لئے اپنے سے بہتر ماحول
پیدا کرنا چاہتا ہے یا بن چاہے بچوں کی وجہ سے سب کے معیار کو پست کرنا چاہتا ہے!
اگر وہ بہت سوں کو مصیبت اور جہالت میں پالنے کی بجائے چند کو تہذیب اور
آرام کے بلند معیار پر پالنا چاہتا ہے تو خاندان کی تحدید اور ضبط تولید لازمی ہیں۔
اگر آپ اپنی اولاد کو اپنے سے بہتر تعلیم دینا چاہتے ہیں، اگر آپ اپنی اولاد کو اعلےٰ تعلیم
اور معقول تربیت دینا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ ضبط تولید
کے موافق بنئے یا کم سے کم ان کی مخالفت نہ کیجئے جو جنسیاتی تعلیم دے کر اچھی فضا پیدا
کر رہے ہیں یا ضبط گاہیں قائم کر کے ضرورت مندوں کو بر وقت جائز مدد پہنچانا
چاہتے ہیں!

اس جدول کی تیاری میں فرض غرض سے مطلوبہ اعداد یا استدلال کے موافقانہ
اعداد حاصل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ہندستان کے مسئلۂ آبادی کی نوعیت ظاہر کرنے
کے لئے، جہاں تک بن پڑا ایمان داری اور غیر جانب داری سے اعداد پیش کئے
گئے ہیں ؛ کم سے کم اپنے مطلب کے اعداد پیش کر کے اپنے خلاف کے اعداد چھپائے
نہیں ہیں۔ ان ہی اعداد کو غیر جانب دارانہ طور پر پیش نظر رکھنے سے ہم محسوس کرتے
ہیں کہ وادیٔ گنگا اور اس کے ملحقہ علاقوں کے برابر یورپ کا کوئی ہم وسیع خطہ آباد
نہیں! وادیٔ گنگا کے برابر گنجانی کہیں ملتی ہے تو وادیٔ نیل (مصر) اور وادیٔ یانگ تسی
کیانگ (چین) میں! "یکساں حالات یکساں نتیجے پیدا کرتے ہیں۔" اسی لئے ان وادیوں

رہنے والوں کی عظیم اکثریت جہالت اور غربت میں پیدا ہوتی ہے، جہالت اور غربت میں پلتی ہے،
اور جہالت و غربت میں مرتی ہے! سیکڑوں برس سے یہی ہوتا چلا آیا ہے، کیا آپ چاہتے
ہیں کہ آئندہ بھی یہی ہو ؟!

بڑھتی آبادی کی رفتار

جہاں حالات موافق ہوتے ہیں اور کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا، رہنے کو مکان نصیب ہوتا ہے وہاں آبادی جس تیز رفتار سے بڑھ سکتی ہے اس کا اندازہ انگلستان کی آبادی کے اعداد سے ہو سکتا ہے۔ تین چار صدیوں سے انگلستان کا شمار ترقی پذیر ملکوں میں ہوتا ہے، خاص کر ۱۹ صدی کی ابتدا سے وہ مسلسل ترقی کر رہا ہے؛ انگلستان کے ماتحت ملکوں اور علاقوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور اس وقت ساری دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر انگلستان کا پرچم لہرا رہا ہے۔

ایک طرف تعلیم اور میکانیت کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت، زراعت و تجارت میں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی وجہ سے دولت پیدا کرنے اور حاصل کرنے کے ذریعوں میں اضافہ ہو رہا ہے مگر دوسری طرف عام تعلیم کی وجہ سے معیار زندگی کو بلند کرنے اور معیار آرام کو بڑھانے کا شوق بہت عام ہو گیا ہے، اس کی خاطر بچوں کی پیدائش پر بڑی روک تھام کی جاتی ہے، ایک بچہ کے بعد دوسرے بچے کی پیدائش تک بہت مہلت دی جاتی ہے جسے اصطلاحی زبان میں SPACING OF CHILDREN یعنے بچوں میں فاصلہ بندی کہتے ہیں۔ بار بار اور جلد جلد بچے پیدا ہونے سے نہ صرف ماؤں کی صحت بری طرح متاثر ہوتی ہے بلکہ بچوں کی توانائی اور جانداری بھی گھٹ جاتی ہے۔ اس کے برعکس بچے موزوں وقتی فاصلوں سے پیدا ہوں تو ماں کی صحت بھی متاثر نہیں ہوتی اور بچوں کی

قدرتی جانداری بھی زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے آئندہ نسل کا معیار صحت بھی بہتر اور بلند تر ہوتا ہے۔

غرض معیار زندگی اور معیار آرام کی خاطر ترقی پذیر یورپ کے ترقی پسند جوڑے "تین بچوں کے طریق" سے آگے نہیں بڑھتے! بہتیرے بے اولاد ہیں، بہت سوں کو ایک ہی بیٹا یا بیٹی یا ایک بیٹا اور بیٹی یا صرف دو بچے ہیں اور عام طور پر زیادہ سے زیادہ تین یا چار!! اس سے زیادہ بچوں والے خاندان کشمکش حیات کی وجہ سے اپنے وقار اور رتبے کو سنبھال نہیں سکتے اور پست تر طبقے میں پہنچ جاتے ہیں لہذا ترقی پسندی کے لئے اولاد کی تعداد کو محدود رکھنا لازمی ہے جس کی خاطر حمل قائم ہونے میں نت نئے طریقوں سے روک تھام کی جاتی ہے اور حمل قائم ہو بھی جائے تو اسے جائز اور ناجائز طریقوں پر ضائع کیا جاتا ہے۔ ان کا فلسفۂ عمل یہ ہے کہ ناخواستہ اولاد نہیں ہونی چاہیئے خاص کر جب کہ ماں باپ کی مالی حالت اس قابل نہ ہو کہ وہ ہونے والے بچوں کی زندگی، تعلیم، تربیت اور معقول ذرائع ترقی کی ضمانت نہ لے سکیں یا اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت دلانے کی معقول توقع نہ کر سکیں! ایسی اولاد سے کیا فائدہ جس کی وجہ سے ماں باپ پریشان ہوں، ان کی ذمہ داریوں میں ناقابل برداشت اضافہ ہو، کھانے کے لئے کافی غذا میسر نہ ہو اور رفتہ رفتہ سب کی صحت اور زندگی خطروں میں مبتلا ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو اپنی اولاد سے اگر واقعی محبت ہے تو وہ کبھی ایسی زائد اولاد ہونے نہیں دینگے جس سے پہلی اور دوسری یا تیسری اولاد کی تعلیم اور تربیت یا صحت و زندگی مخدوش ہو جائیگی، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ ماں باپ کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے سے بہتر اپنی اولاد کے لئے ذرائع زندگی اور ذرائع ترقی پیدا کریں۔ اگر ان کے حاصل کرنے کی کوئی توقع نہیں تو پھر ماں باپ کو بھی اولاد پر اولاد پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے، خاص کر جب کہ ماں باپ دماغی اور جسمانی اعتبار سے

خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہوں ۔ اسی لئے یورپ کی بعض ترقی پذیر ریاستوں میں لاعلاج اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو جبری طور پر "بانجھ دیا" جاتا ہے تاکہ ان کی وجہ سے خطرناک معذوروں کی تعداد میں اضافہ نہ ہوسکے ۔ بعض لوگ اپنی رضامندی سے بانجھ ہو جاتے ہیں تاکہ کثرت اولاد کا ٹنٹا ہی نہ رہے ۔ مختصر یہ کہ ترقی پسند ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی آبادی کو محدود کرنے والے بہت سے اسباب کارفرما ہیں ۔ پھر بھی آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ ان اعداد سے ہوسکتا ہے :

۱۹ صدی کی ابتدا سے انگلستان اور ویلز کی آبادی

	کل تعداد	گنجانی یعنے ہر چوکور میل پر لوگوں کی تعداد
۱۸۰۱ء میں انگلستان اور ویلز کی آبادی	۸۹،۰۰،۰۰۰	۱۵۲
۱۸۳۱ء " " "	۱،۳۹،۰۰،۰۰۰	۲۳۸
۱۸۵۱ء " " "	۱،۷۹،۰۰،۰۰۰	۳۰۷
۱۸۶۱ء " " "	۲،۰۰،۰۰،۰۰۰	۳۴۴
۱۸۹۱ء " " "	۲،۹۰،۰۰،۰۰۰	۴۹۷
۱۹۰۱ء " " "	۳،۲۵،۰۰،۰۰۰	۵۵۸
۱۹۱۱ء " " "	۳،۶۰،۰۰،۰۰۰	۶۱۸
۱۹۲۱ء " " "	۳،۷۸،۰۰،۰۰۰	۶۴۹
۱۹۳۱ء " " "	۴،۰۰،۰۰،۰۰۰	۶۸۸
۱۹۴۱ء " " "	۴،۱۷،۰۰،۰۰۰	۷۱۷

ان اعداد پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ۱۸۰۱ء اور ۱۸۹۱ء کی آدھ صدی میں انگلستان اور ویلز کی آبادی دوگنی ہوگئی اگر ۱۸۹۱ء سے ۱۹۴۱ء تک کی آدھ صدی میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا تو وہاں کی آبادی دوگنی ہوکر ۵،۸۰،۰۰،۰۰۰ یعنے تقریباً چھ کروڑ ہوگئی ہوتی مگر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں آبادی ۴ کروڑ بھی نہیں تھی اس سے ظاہر ہے کہ انگلستان میں اضافۂ آبادی کی رفتار کم ہوتی جارہی ہے۔

یورپ کے بعض ملکوں میں اضافۂ آبادی کی رفتار اتنی دھیمی ہوگئی ہے کہ آبادی تقریباً مساوی رہنے لگی ہے اور سیاسی اور فوجی نقطۂ نظر سے رہنماؤں کی تشویش کا باعث ہوگئی۔

انگلستان اور ویلز میں تو ہمہ گیر ترقیوں کی وجہ سے آبادی میں اضافہ ہوا مگر جہاں ذاتی پرچم ہے نہ فوج، حکومت ہے نہ دولت، طاقت ہے نہ میکانیت، مقبوضے ہیں اور نہ نوآبادیاں وہاں بھی تیز رفتار سے آبادی میں اضافہ ہورہا ہے۔ چنانچہ فاقہ کشی، قحط، طاعون، ہیضے، چیچک اور دوسری قابل انسداد بیماریوں کے باوجود ہندستانیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ محض "رُوحانیت" کے برتے پر!

۱۸۹۱ء	میں ہندستان کی آبادی	۲۷،۹۴،۰۰،۰۰۰
۱۹۰۱ء	" " "	۲۸،۳۹،۰۰،۰۰۰
۱۹۱۱ء	" " "	۳۰،۳۰،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۱ء	" " "	۳۰،۵۷،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۱ء	" " "	۳۳،۸۱،۰۰،۰۰۰
۱۹۴۱ء[1]	" " "	۳۸،۹۰،۰۰،۰۰۰

۱؎ ۱۹۳۷ء میں برما ہندستان سے علحدہ کردیا گیا تھا لہذا ۱۹۴۱ء میں برمی آبادی کا

دونوں جدولوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ پچاس برس میں انگلستان اور ویلز کی آبادی میں خالص اضافہ ...،..،۴۲،۱ اور اسی مدت میں ہندستان کی آبادی میں خالص اضافہ ...،..،۹۶،۰،۱۱ کا ہوا۔ انگلستان کی آبادی کو ہزاروں نئے ذرائع معاش، ملک کے باہر بھی نوکریاں، گتے، ٹھیکے نصیب ہوئے۔ اس لئے انگلستان نہ صرف زائد آبادی کو پال سکا بلکہ اپنا معیار آرام اور معیار زندگی بھی بہتر کر سکا۔ اس کے برعکس ہندستان نے جو معمولی ترقی کی وہ آبادی کی زائد تعداد کے نذر ہوگئی اور ملک نے مجموعی حیثیت سے کوئی ترقی نہیں کی۔ جس بری حالت میں ہم سو دو سو برس پہلے زندگی بسر کر رہے تھے اسی طرح اب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم دولت پیدا تو زیادہ کر رہے ہیں مگر زائد پیدا وار بڑھتی ہوئی

شماریوں بھی نہیں کیا جاتا۔ چونکہ ۱۹۳۱ء تک برمی آبادی کا شمار ہندستان کی آبادی میں ہوتا تھا اس لئے ضروری تھا کہ ۱۸۹۱ء اور ۱۹۳۱ء تک کی تعداد سے برمی آبادی منہا کی جائے۔ چنانچہ پیش کردہ اعداد خالص ہندستان سے متعلق ہیں۔ اس کے برعکس سٹیٹسمن ٹیربک وغیرہ میں برما کے اعداد شامل رکھے گئے ہیں۔ عامیانہ اور غیر ماہر واقف کاروں کے اندازوں میں اکثر غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ وہ ان اہم تغیرات سے ناواقف ہوتے ہیں۔

بعض کتابوں میں انگلستان کے تحت انگلستان اور ویلز کے اعداد دئے جاتے ہیں اور بعض میں برطانیہ عظمی کے اعداد ہوتے ہیں حالانکہ انگلستان سے ویلز اور ان دونوں سے سکاٹ لینڈ اور ان تینوں سے شمالی آئرستان علیحدہ ہیں۔ ان جزوی باتوں پر خاص طور پر توجہ اس لئے دلائی جا رہی ہے تاکہ معترض بھی احتیاط کریں اور من مانے طور پر اعداد کو غلط نہ قرار دیدیں۔ احتیاط کی توقع غیر ماہروں سے ناممکن اور نام نہاد ماہروں سے بھی کم ہو سکتی ہے۔

آبادی کی نذر ہو جا رہی ہے۔

اگر ہم بھی دوسری ترقی یافتہ اور ترقی پذیر قوموں کی طرح ترقی کرنا چاہیں تو ہمارے لئے دو مسئلوں کا حل کرنا ضروری ہے: ایک تو یہ کہ زیادہ دولت حاصل کریں جس کے لئے زیادہ ذرائع معاش حاصل کرنا ضروری ہے اور پیدا کردہ اور حاصل شدہ دولت کو معقول طور پر تقسیم کریں جس کے لئے آبادی کو محدود کرنا لازمی ہے۔ اگر واقعی "ایک انار اور سنو بیمار ہوں" یا پچاس روپے ماہانہ کمانے والے کے ہاں ایک درجن کھانے والے موجود ہوں تو ترقی کے لئے تعداد کا گھٹانا لازمی ہوگا۔ یہی صورت حال ہندستان میں پیدا ہو چکی ہے اور یہاں کی غربت اور مصیبت کی ایک وجہ ہمارے ملک کی اضافی کثرت آبادی ہے۔

محدود ذرائع آمدنی اور سست رفتار ترقی کے مقابلے میں آبادی کس قدر بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ گذشتہ دہائیوں کی گنجانی سے ہوگا۔

۱۹۰۱ء میں ہندستان میں اوسطاً ۱۷۹ لوگ ہر چوکور میل پر تھے
۱۹۱۱ء " " " " ۱۹۱ " " " "
۱۹۲۱ء " " " " ۱۹۳ " " " "
۱۹۳۱ء " " " " ۲۱۳ " " " "
۱۹۴۱ء " " " " ۲۴۶ " " " "

گویا اس صدی کے شروع سے اب تک ۶۷ افراد کا فی چوکور میل بڑھ گیا ہے؛ اور زمانے کی رفتار کے مطابق جتنی ترقی ہم نے کی تھی وہ بڑھتی آبادی کی وجہ سے فنا ہو گئی۔ اگر اتنی مدت میں آبادی مساوی رہتی یا گھٹ جاتی تو بے شک جابجا ترقی کے آثار دکھائی دیتے؛ شہروں اور قصبوں یا گاؤں کے مہاجنوں کے بہی کھاتوں سے زیادہ عوام کی ظاہری حالت میں یا شرح موت کے گھٹتے ہوئے اعداد میں، بڑھتی ہوئی مدت حیات میں! مگر آج حالت اتنی اچھی نہیں ہے۔ ہم اُسی نقطے کے قریب ہیں جہاں اس صدی کی ابتدا میں تھے۔ ہماری قوم کی عظیم اکثریت بھوکی ہے، ان پڑھ ہے، چھیتڑوں اور کچی جھونپڑیوں پر قناعت کرنے پر مجبور ہے۔ اور دین و دھرم کے نام سے قناعت کا [illegible] سبق دینے والے بہتیرے غرض مند ہیں جو قوم کو محکومیت اور غربت میں مبتلا رکھے ہوئے ہیں۔

ہندستان کی شماریاتِ آبادی

اور

اُس کی عمرانیاتی تشریح

ہندستان کی مردانی اور نسوانی آبادی

مردانی آبادی سے مراد صرف بالغ آبادی ہی نہیں بلکہ سارے ملک کے تمام بچے، لڑکے، نوجوان، جوان اور ادھیڑ مرد اور بوڑھے ہیں۔ نسوانی آبادی میں تمام بچیاں، نوجوان، جوان اور ادھیڑ عورتیں اور بوڑھیاں شریک ہیں۔ یورپ کے تمام ملکوں میں مردانی آبادی کے مقابلے میں نسوانی آبادی زیادہ ہوتی ہے مگر ہندستان میں تمام مردم شماریوں کے مطابق نسوانی آبادی سے مردانی آبادی زیادہ ہوتی ہے چنانچہ ۱۹۴۱ء کے گناوے سے ظاہر ہے کہ

سارے ملک میں بیس کروڑ دس لاکھ بچے، لڑکے اور مرد ہیں

اور اٹھارہ کروڑ اسی لاکھ بچیاں، لڑکیاں اور عورتیں ہیں

گویا ۱،۳۰،۰۰،۰۰۰ یعنے ایک کروڑ تیس لاکھ کی مردانی آبادی زیادہ ہے!

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مردوں اور عورتوں، لڑکوں اور لڑکیوں، بچوں اور بچیوں کی تعداد برابر ہوگی کیونکہ "قدرت جوڑے بنا بنا کر بھیجتی ہے" یا "جنت ہی میں جوڑے بنا دیے جاتے ہیں۔ بہتیرے مردوں کا یقین ہے کہ "مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہوتی ہے، اسی لیے دو بیویاں رکھنا یا دو سے زیادہ شادیاں کرنا نہ صرف جائز بلکہ لازمی اور قدرت کا اٹل قانون ہے!"

انگریزی کی ایک بڑی اچھی کہاوت ہے کہ

"The devil himself can quote the scripture" "خود شیطان بھی مقدس تحریر کا حوالہ دے سکتا ہے!"

یہ کہاوت اس عام ذہنیت کا پتہ دیتی ہے کہ لوگ اپنے کرتوتوں کو جائز یا ضروری ظاہر کرنے کے لیے بلکل غیر متعلق اور بسا اوقات متضاد حوالے دیتے ہیں اور اپنی خود غرضانہ نفسانیت میں اتنے بہک جاتے ہیں کہ جس ثبوت سے ان کے بیان یا اعتقاد کی تردید ہوتی ہے اسی کو وہ اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اسی قسم کے مغالطے میں وہ لوگ مبتلا ہیں جو اس مفروضے کے تحت کہ ہر جگہ مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہوتی ہے کثرتِ ازدواج کو قدرت کا "اٹل قانون" سمجھتے ہیں!

انھیں معلوم کرکے کس قدر حیرت ہوگی کہ ہر جگہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور پیدائش کے وقت ہی بچوں اور بچیوں کی تعداد میں عدم تناسب ہوتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں مشاہدوں اور سالہا سال کا تجربہ رکھنے والوں کے بیانوں، نیز شماریاتی تحقیقوں سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جہاں ہزار لڑکے پیدا ہوتے ہیں تقریباً ۹۵۴ لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اور فی ہزار چالیس سے پچاس تک لڑکیوں کی کمی ہوتی ہے۔

اکثر گھرانوں میں لڑکوں کی دیکھ بھال زیادہ ہوتی ہے اور لڑکیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مذہبی تعصبات یا وہم پرستیاں لڑکیوں کے خلاف ہیں۔ معاشی نقطۂ نظر سے بھی لڑکے کو آمدنی کا ذریعہ اور لڑکی کو خرچ کا مد تصور کیا جاتا ہے۔ ہزاروں تعلیم یافتہ

اور مغربی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ اور لاکھوں مغربی تعلیم سے فیض یافتہ لوگ موجود ہیں جو لڑکے کی پیدائش سے خوش اور لڑکی کی پیدائش سے افسردہ ہو جاتے ہیں!! لڑکے کے پیدا ہونے پر خوشیاں منانا ایک عام رسم ہے۔ ولیعہد سلطنت سے لے کر معمولی گھرانے میں لڑکے کی پیدائش کو خاندان کے تسلسل، مضبوطی اور درخشاں مستقبل کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے اور سب سے زیادہ "بقائے نام" کا ذریعہ!! شاعر و ادیب، عالم و جاہل، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ؛ سب کے سب اپنی نظموں، کہانیوں، قصوں، اور روز مرہ کی بحثوں اور گفتگو سے اس خیال کی تشہیر کرتے ہیں کہ ذاتی اور خاندانی دونوں نقطۂ نظر سے لڑکی سے لڑکا بدرجہا بہتر ہوتا ہے!

اس تعصب آمیز مغالطے کا لازمی اثر لڑکیوں کی دیکھ بھال پر پڑتا ہے اور نسبتاً زیادہ بچیاں مرکھپ جاتی ہیں اور اس غیر متناسب توجہ اور حفاظت کی وجہ سے مردانی اور نسوانی آبادی کا عدم تناسب بڑھ جاتا ہے۔

ہندستان کے عام سماجی رواج کے مطابق لڑکیوں کی شادی بہت ہی کم عمری (اگر یا قانونی مجبوری ہو تو) تو جوانی کی بالکل ابتدائی حالت میں کردی جاتی ہے۔ انسانی بدن اچھی طرح نشو و نما نہیں پاتا کہ پیدائش کا ذریعہ بنا دیا جاتا ہے؛ نیز اکثر لڑکیوں اور عورتوں کو جلد جلد اور بار بار حمل سے زیر بار ہونا پڑتا ہے جس کو ان کی کم طاقتی برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ انھیں افلاس کی وجہ سے ناکافی اور ناموافق غذا ملتی ہے اور اکثر ماہرانہ امداد کے بغیر (صرف اناڑی دائیوں یا غیر تجربہ کار عورتوں کے سہارے) اپنے ماں پن کے فرائض کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہندستانیوں کی ازدواجی زندگی کے تاریک رسوم نے قومی تباہی میں بہت کافی حصہ لیا ہے اور آج کروڑوں لوگوں کی کم طاقتی، بیماری، سدا کے روگ وغیرہ کا ایک ؟ ہم سب گذشتہ نسلوں کی غفلت، ہمارے آبا و اجداد کی جاہلانہ تنگ نظری؛ اور قومی رہنماؤں اور حاکموں کی مجرمانہ لاپرواہی ہے۔ ہم ایک ایک کرکے اپنی نادانیوں اور کم سمجھیوں کی سزا

بھگت چکے ہیں ۔ ہم نے حکومت کھوئی ، حاکم سے محکوم بنے ؛ ہم نے دولت گنوائی مرفہ الحال سے مفلس اور کنگال ہوئے ، ہم نے صحت اور طاقت کو برباد کرنے والی یا دونوں کے معیار کو گھٹا کر زندوں کی جان کو دوبھر بنانے والی رسمیں اختیار کرکے نہ صرف خود کو مصیبت میں گرفتار کیا بلکہ تمام قوم کے مستقبل کو خطرے میں بتلا رکھا ہے ۔ مستقبل کی امیدوں کا ذریعہ مرد اور عورت دونوں ہیں اور دونوں کی طاقت وصحت کی سلامتی سے طاقتور اور صحت مند اولاد پیدا ہوسکتی ہے ۔ قومی صحت و طاقت کے معیار کو بڑھانے کے لئے جہاں معاشی دولت ، سیاسی نگرانی اور عمدہ علاج معالجہ اور حفاظت صحت کی تدبیریں لازمی ہیں وہاں عمدہ سماجی ماحول بھی ضروری ہے تاکہ کم سنی کی شادی نہ ہو ! بالکل عنفوان شباب میں شادی نہ کردی جائے ، جلد جلد اور بار بار کے حمل سے عورتوں اور بچوں کی صحت کو بری طرح متاثر نہ کیا جائے ، پردے کی قید اٹھادی جائے اور ماہرانہ علاج سے حجاب نہ ہو ۔

غرض کئی وجوہ سے (جن میں شادی کی رسمیں اور اناڑی دائیاں بھی شریک ہیں) عورتوں کی تعداد اور زیادہ گھٹ جاتی ہے اور پچاس برس سے کم عمر والی آبادی میں مردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ، عورتوں اور لڑکیوں کی نسبتاً اور کم ۔

قدرتی عدم تناسب کی اہمیت شادی بیاہ کی رسموں اور سماجی طریقوں کے علاوہ ایک اور سبب سے بڑھ جاتی ہے : ہندوؤں اور مسلمانوں ، جینوں اور سکھوں میں دو دو ، تین تین اور چار چار شادیاں کرنے کی اجازت اور رواج ہے [1] ۔ بعض خوش حال لوگوں کے پاس منکوحہ یا بیاہتا اور جائز یا قانونی بیویوں کے علاوہ رکھیلیوں اور خواصوں کی پلٹن کی پلٹن ہوتی ہے ۔ اور ایسے بھی نام نہاد مذہبی رہنما اور "مخلص" رہبر موجود ہیں

---

[1] ۔ عیسائیوں اور پارسیوں کا نام جان بوجھ کر نہیں لیا گیا کیونکہ عیسائیوں اور پارسیوں کے لئے پہلی بیوی کی زندگی میں یا اس کو باقاعدہ طور پر طلاق دیئے بغیر دوسری شادی قانونی طور پر منع ہے ۔

جن کی ناپاک زندگیوں کا تاریک ترین باب ان کی جنسی زندگی ہے! جس میں جرائم اور عصمت فروشی، منظم فریب اور سرتاپا نفسانیت پائی جاتی ہے۔ غرض ہندستان میں ہزاروں دو بیوی یا تین بیوی یا کئی بیوی ہیں جن کی وجہ سے مردانی اور نسوانی آبادی میں عدم تناسب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور اس عدم تناسب کی وجہ سے شدید سماجی مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب مردوں اور عورتوں کی تعداد میں شروع ہی سے فرق ہوگا تو یہ فرق آسانی سے مٹایا نہیں جا سکے گا اور اس فرق کا دُور کرنا ناممکن ہوگا اگر ہمارا سماجی ماحول اور سماجی زندگی پر اثر انداز ہونے والے مذہبی رواج اور سرکاری قانون اس فرق کو مٹانے کی بجائے اُلٹا اور بڑھائیں۔ غرض کئی وجہوں سے ہندستانی مردوں کی ایک معقول تعداد بن جوڑے کے رہ جاتی ہے اور وہ اپنے قدرتی جذبات کو تشفی پہنچانے کے لئے وہ راستہ اختیار کرتے ہیں جو روز ازل سے تہذیب و تمدن کے لئے کلنک بنا ہوا ہے۔

عصمت فروشی کی منظم تجارت اور اس تجارت کے تاریک ترین پہلوؤں کو بیان کرنے کے لئے صرف ایک مثال سُنئے کہ ہزاروں لڑکیاں دھوکے اور بھوک سے مجبور ہو کر اس پیشے میں ڈھکیلی جاتی ہیں اور ان میں سب سے زیادہ بدنصیب وہ قابلِ رحم ہستیاں ہیں جو چھوانیوں اور دوانیوں کے لئے ہمہ قسم کے رذیلوں اور اوباشوں، بیماروں اور نفس پرستوں کو گوارا کرنے پر مجبور رہیں۔ ان کی مجبوری اور بے بسی انھیں اس خطرناک پیشے سے نکلنے نہیں دیتی، وہ نکلنا چاہیں بھی تو سماج اور استحصال کا جال نکلنے نہیں دیتا اور وہ بہت جلد خود بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر کھپ جاتی ہیں۔ اس طبقے کی سب سے زیادہ بدقسمت ہستیاں دو تین سال ہی میں موت کا شکار ہو جاتی ہیں! پھر بھی ہمارے اخلاق پرست نقاد اور انصاف کا دعوےٰ کرنے والے مولوی ان بیچاریوں پر "نفسانیت" کا الزام لگاتے ہیں!! گویا وہ اپنے عزم، ارادے، شوق اور انتخاب سے

"حرام کاری" میں مبتلا ہیں۔؟

"حلال کاریوں" کا نتیجہ تو ما تر مندر ہیں اور دیوداسی طریق یا مریدوں کی بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں اور بھتیجیوں کے ساتھ حسنِ سلوک! ان باتوں کی تفصیل پیش کرنے کی تاب ہوتی بھی تو ہمارے خود پسند سماج میں سننے اور برداشت کرنے کی اہلیت کہاں ہے؟

اعداد و شمار کی روشنی میں مختلف تمدنی اور سماجی مسئلوں کی توضیح کرتے ہوئے مجھے کئی بار خیال آیا کہ اعداد و شمار پر سماجی رسموں اور طریقوں کا اثر پڑتا ہے یعنے یہ کہ ان کی نوعیت و اہمیت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ مردانی اور زنانی آبادی میں عدم تناسب جو بہر حال فطرت کے اٹل دستور کی وجہ سے شروع ہوتا ہے، لڑکیوں اور عورتوں کی عدم حفاظت اور ان کی جانیں ضایع جانے کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ ہندستان میں طلاق کی ممانعت یا محدود رواج ہے، نیز بیواؤں سے دوبارہ شادی بری نظروں سے دیکھی جاتی ہے اور ہندوؤں کے کئی فرقوں میں قانونی طور پر منع اور مسلمانوں میں عملاً دشوار اور بعض جماعتوں میں ناممکن ہے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات مخصوص فرقوں، طبقوں اور جماعتوں میں شادی کرنے والے مرد تو زیادہ ہوتے ہیں مگر قابلِ بیاہ عورتیں یا لڑکیاں کم ہوتی رہیں۔ چونکہ ہمارے ملک میں ذات پات کی بندشیں ہیں، نیز نسل، فرقے اور جماعت کا خیال بھی بہت کیا جاتا ہے اس لئے بعض مرتبہ ایسی صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ ایک شخص کو شادی کے لئے اپنی جماعت میں لڑکی کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑتا ہے!!! اور ایسا بھی ہو چکا ہے کہ کسی حاملہ کے بطن کے بچے سے کسی نوجوان کی مشروط شادی ہوئی ہے! جو صرف بچے کے ہم جنس ہونے کی صورت میں کالعدم یا منسوخ ہو جاتی ہے!

"دلہن مول" یعنے بیاہ کے لئے لڑکی کے ماں باپ کو نذر دینے کا طریقہ بھی بیاہ کے آرزومند مردوں کی کثرت اور عورتوں کی کمی یا قابلِ بیاہ عورتوں کی قلت کی

وجہ سے پیدا ہوا ہوگا۔ اگر ان ہی جماعتوں میں بیواؤں سے دوبارہ شادی کرنے اور طلاق کو جائز یا مروج کرنے کے طریقے اختیار کیے جائیں تو "لڑکیوں کا کال" کم ہو جائے! کیونکہ نہ صرف بہت سے مرد خاص کر ادھیڑ اور رنڈوے، بیواؤں سے شادی کریں گے بلکہ دوسری بیوی لانے سے قبل پہلی کو رہا کریں گے یا رہا کرنے پر مجبور ہونگے! جن گھرانوں میں دو دو تین تین بن بیاہی لڑکیاں "بیٹھی" ہیں اور تلاش کے باوجود بر نہیں ملتا اور جو جہیز دینے تیار ہیں وہ معکوس جہیز "دلہن مول" کے فلسفے کو ناقابل اعتبار سمجھیں گے! مگر حقیقت کیونکر بدل سکتی ہے؟ دنیا کی ہر جنس کی طرح شادی بیاہ کے بازار میں کہیں قلت ہے کہیں کثرت! کبھی زیادتی ہے کبھی کمی! کہیں ان کا حاصل کرنا دشوار ہے اور کہیں ان کا اٹھانا ناممکن! اس کا بھی نام دنیا ہے!

ہندستان دیہاتی ملک ہے

۳۸،۹۰،۰۰،۰۰۰ یعنے تقریباً ۳۹ کروڑ لوگوں میں سے

۳۳،۹۳،۰۰،۰۰۰ " " ۳۴ " گانو کھیڑوں میں رہتے ہیں

۴،۹۶،۰۰،۰۰۰ " " ۵ " قصبوں اور شہروں میں

لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانیوں کی عظیم اکثریت دیہاتی ہے شہری نہیں! پھر بھی سیاح، حاکم، محقق، اڈیٹر شہروں کو ہندستان سمجھتے ہیں اور کلکتہ اور بمبئی، کراچی اور مدراس، حیدرآباد اور لکھنو، بریلی اور بنگلور، بروڈا اور میسور کے حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہی "ہندستان" ہے۔ حالانکہ حقیقی ہندستان گمنام کھیڑے، غیر مشہور گانو، چھوٹی چھوٹی بستیاں اور منتشر جھونپڑیاں ہیں، جہاں نہ "لائیٹ" ہے نہ ریڈیو، اخبار ہے نہ مدرسہ، موٹریں ہیں نہ ہسپتال!

اشوک اعظم کے قدیم ترین زمانے میں یا مغل بادشاہوں کے سنہرے دور میں

یہ لوگ جس طرح رہتے بستے تھے تقریباً اب بھی رہتے بستے ہیں۔ انپڑھ، نیم فاقہ کش، بیماریوں میں مبتلا، پھر بھی حیرت انگیز طور پر مطمئن اور جاندار! ان کا فلسفۂ حیات، سکون پسندی، اطمینانِ قلب، مہمان نوازی، خوش سلوکی، ہمدردی قابل تعریف مگر ان کی گندگی، کاہلی، ضرورت سے زیادہ قناعت پسندی اور سب سے زیادہ سماج پرستی قابل نفرت ہے۔

ہندستان کو سنبھالنا ہے تو اس کی ابتدا شہروں کے ساتھ ساتھ گانوؤں میں کرنی چاہیے کیونکہ ہندستان میں اگرچہ

۵۷ بڑے شہر ہیں جن میں سے ہر ایک کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے

۹۵ " " " " " " ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک ہے

۳،۷۵۰ قصبے ہیں " " " " دس اور پچاس ہزار کے درمیان ہے

گویا ۳،۹۰۲ شہروں اور قصبوں میں تقریباً پانچ کروڑ کی آبادی ہے

مگر ۲۲،۱۵۱ بڑے گانو ہیں جن میں سے ہر ایک کی آبادی دو اور پانچ ہزار کے درمیان ہے

۱،۸۱،۳۱۹ چھوٹے گانو ہیں " " " " پانسو سے دو ہزار تک ہے

اور ۴،۵۰،۹۰۲ کھیڑے ہیں جن کی آبادی پانسو سے بھی کم ہے

یعنے ۶،۵۴،۳۷۲ بستیوں میں ۳۴ کروڑ کی آبادی۔

ہندستان کی کُل آبادی میں سے فی سو ۱۳ آدمی شہروں، اور قصبوں میں رہتے ہیں اور ۸۷ گانو کھیڑوں میں!

پھر بھی مرکزی حکومت کی طرح، صوبائی اور ریاستی حکومتیں اپنی عنایتیں زیادہ تر شہروں پر کرتی ہیں۔ تعلیم اور آرائش، صاف پانی اور نمایش، عمدہ سڑکیں اور روشنی، دواخانے اور زچہ خانے، بے گردی سڑکیں اور کھیلوں کے میدان اور تفریح گاہیں، باغ اور جھولے زیادہ تر شہروں کے لیے فراہم کئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بڑے بڑے بنک گانو کھیڑوں میں نہیں کھولے جا سکتے اور گانو کو کسی ریلوے کا مرکز نہیں بنایا جا سکتا! مگر اس کے یہ معنے تو نہیں کہ شہروں میں فالتو درس گاہیں یا کالجوں پر کالج کھلتے جائیں!

اور ہزاروں گانو یں معمولی سا مکتب یا پاٹ شالہ بھی نہ ہو! سرکاری رقموں سے بڑے شہروں کی زیبایش اور آرایش پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا جائے مگر دو دو ہزار کی بستیوں یں ایک بھی تربیت یافتہ ماہر دائی نہ ہو، شہر کی نمایشوں اور عجائب گھروں پر قوم کا بے حساب روپیہ صرف ہو مگر ہزار ہزار کی آبادی والے گانو کے بچوں کے لیے ایک جھولا اور کرتبی ڈنڈا بھی نصب نہ کیا جائے! اصل بات یہ ہے کہ حاکموں کے زاویۂ نگاہ میں انقلاب کی ضرورت ہے اور اس ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے لاکھوں تعلیم یافتہ اورحقیقت سے باخبر افراد درکار ہیں۔ جب لاکھوں کی تعداد میں یہ لوگ قومی مرفہ الحالی اور تباہی، ترقی اورجمود، زوال اور موت کی کہانی پڑھیں گے اوران کے وجوہ معلوم کریں گے تو قدرتی طور پر ان میں کئی کو سُدھار کا خیال ہوگا اور ان میں سے چند کو صحیح عمل کی توفیق نصیب ہوگی ۔ تمدن کی اصلاح کے لیے تمدن کے سمجھنے والوں کی ضرورت ہے ۔ سماج اور معیشت، مذہب اور سیاست کے سمجھنے والے ہی زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان میں موافقانہ تبدیلیاں پیدا کرسکتے ہیں ۔

شہری آبادی

ہندستان کے سب سے بڑے دس شہر

تہذیب و شایستگی کے نقطۂ نظر سے نہیں ، باشندوں کی دولت اور خوش حالی کے زاویۂ نگاہ سے نہیں ، صحتِ عامہ کے اعتبار سے نہیں ، معیارِ تعلیم اور معیار آرام کے لحاظ سے بھی نہیں بلکہ صرف باشندوں کی مجموعی تعداد کے مطابق !! چاہے ان میں کتنے ہی بے روزگار ، سدا کے روگی یا اَنپڑھ ہوں یا مصیبت و جہالت میں مُبتلا ہوں یا جرائم پسندی اور استحصال ، لُوٹ اور فریب سے روزگار حاصل کر رہے ہوں یا تعطل اور بیکاری میں طفیلیوں کی طرح مفت خوری کرنے پر مجبور ہوں ، چاہے ان میں بہتیرے سرکاری تجوری اور قومی آمدنی پر بیجا بار ہوں یا بخت اور اتفاق سے اپنے باپ دادا کی طرح قوم کے سہارے نخوت اور تعیش سے زندگی بسر کر رہے ہوں !

کلکتہ اور ہاوڑا کی آبادی ۱۹۴۱ء میں ۲۴،۸۰،۰۰۰

بمبئی " " ۱۴،۹۰،۰۰۰

مدراس " " ۷،۷۷،۰۰۰

حیدرآباد (دکن) " " ۷،۳۹،۰۰۰

لاہور " " ۶،۷۲،۰۰۰

احمد آباد کی آبادی ۱۹۴۱ء میں			۵،۹۲،۰۰۰
دہلی	〃	〃	۵،۲۲،۰۰۰
کانپور	〃	〃	۴،۸۷،۰۰
امرتسر	〃	〃	۳،۹۱،۰۰۰
لکھنو	〃	〃	۳،۸۷،۰۰۰

ان تمام شہروں کی عام اور مشترک خصوصیت یہ ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کم، بعض میں بہت کم ہے ۔ شہروں میں مردانی آبادی کی نمایاں کثرت شہریوں کے جنسی اخلاق پر اثرانداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ اسی لیے ہر شہر میں عصمت فروشی کا بھی بازار ہوتا ہے جس کی رونق اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ شہروں میں رہنے والے کماؤ مرد بہت ہوتے ہیں جن کی روک ٹوک کرنے والیاں کوئی نہیں ہوتیں اور بے لگام ہوکر اپنے نفسانی خواہشوں کو پورا کرتے ہیں ۔ ان ہی اسباب کی بنا پر تمدن کی ابتدا سے علم اور حکمت کے ساتھ ساتھ شہر جرائم، نفسانیت، فریب اور جھوٹ کا مرکز رہے ہیں!! ان کی تاریخ سرتاپا کامیابیوں اور کامرانیوں کی سرگذشت نہیں بلکہ سفید و سیاہ کا مجموعہ ہے۔ ان کی تاریخ میں بعض صفحے اچھے ہیں، بعض رنگین ہیں، بعض پر سنہرے حرفوں سے دل پذیر داستان لکھی ہے مگر بہتیرے ورقوں پر رنج و مصیبت کی نشانی، کالی پٹی، چھپی ہے ۔ بہت سے صفحوں پر مندرجہ نامۂ اعمال افسوس ناک اور شرم ناک ہے۔ ان میں سے کئی صفحے ناقابلِ بیان اور ناقابلِ تشریح سیاہ کاریوں کی سرگذشت پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب کے جزو جزو دکھ بھری کہانیوں، مصیبت کے سچے قصوں اور ظلم و استحصال کے شکار بھولے بھالے یا کم سمجھ یا زود اعتماد بدقسمتوں کی درد بھری داستانوں سے لکھے گئے ہیں ۔

ان تمام شہروں کی ایک اور مشترک خصوصیت مکانوں کی قلت اور صفائی کی

غیر تشفی بخش حالت ہے؛ امیروں کے محلوں، عہدہ داروں کے رہائشی حصوں، سرکاری دفتروں اور بڑے بڑے بازاروں اور باغوں کے علاوہ ہر شہر میں غریب واڑے اور غلیظ واڑے ہیں؛ جن کی تاریکی اور گندگی بیسویں صدی ہی پر نہیں انسانیت پر ایک بدنما داغ ہے۔

انسانیت نے خاص کر مشرق میں ابھی اس بات کو اچھی طرح محسوس نہیں کیا کہ شہروں کی رونق سمنٹ کی شاہراہوں، عالیشان محلوں، خوب صورت ناموں، موثر تشہیر اور زر خرید یا جبری ستائش میں نہیں بلکہ شہریوں کی صحت، اخلاق، تعلیم اور مرفہ الحالی میں ہے۔

حیدر آباد کے متعدد لوگ فخریہ کہتے ہیں کہ "حیدر آباد ہندستان کا چوتھا بڑا شہر ہے" اس عامیانہ ذہنیت کا انکشاف ان عہدہ داروں نے بھی کیا جنھوں نے ۱۹۴۱ء کے اعداد شایع کرتے ہوئے بڑا اطمینان ظاہر کیا تھا کہ

"حیدر آباد ہندستاں کے شہروں میں چوتھے درجے کو برقرار رکھ سکا"

کلکتہ کے کم ظرف اس خصوصیت پر ناز کرتے ہیں کہ کلکتہ

"مملکتِ برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر ہے"۔

دوسرے یا چوتھے ہونے پر خوشی یا فخر یا ناز کی کیا بات ہے جب کہ ہزاروں شہری ان پڑھ ہیں، لاکھوں بے گھر ہیں، اور ان گنت تعداد افلاس اور بھوک کی اٹل مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ عمرانیات اور اخلاقیات ہی نہیں، سیاسیات اور علم تمدن ہی نہیں، انسانیت، شرافت، تہذیب اور شایستگی کے نقطۂ نظر سے کیا یہ زیب دے سکتا ہے کہ جن شہروں میں لوگ بھوکوں مر رہے ہیں اس کی تعداد پر ناز کیا جائے یا جن بھکاریوں اور معذوروں کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو ان کو بھی شہری تعداد کو "باوقار" بنانے کے لیے شمار کر لیا جائے!! بڑی تعداد سے مرعوبیت بیسویں صدی کی ذہنی کمزوری ہے۔

دکھی بھارت
یعنے
بیماریوں میں مبتلا
اور
سدا کا روگی ہندستان

کل ہندستان کی صحتِ عامّہ کی ایک حالیہ روئداد میں لکھا ہے:

"میعادی اور پیلے بخار کو چھوڑکر Excepting typhoid and yellow fever
ہندستان دُنیا کے لیے اثرانگیز India is one of theworlds reservoirs
بیماریوں کا سرچشمہ ہے، طاعون of infection for the others ond the main
اور ہیضے کے لیے تو جراثیم کا خاص reservoir of infection for plague and
مہاساگر!" cholera.

کیا تعریف ہے ہندستان کی! وہ ملک جس نے قدیم زمانے میں شانتی اور محبت کا پیام بھیجا تھا اور جہاں کے مقدّس مقاموں سے فیض یاب ہونے کے لیے دور دور سے جاتری آتے تھے آج ساری دنیا کے لیے گھناؤنی بیماریوں کا سرچشمہ اور خطرناک جراثیم کا مہاساگر بنا ہوا ہے۔ ہیضہ اور چیچک، طاعون اور کوڑھ ہندستان میں اس طرح جمے بیٹھے ہیں جیسے کسی جیو رکشا سبھا میں پالتو جانور!

اس میں شک نہیں کہ ان بیماریوں اور وباؤں کا وجود ہر غیرت مند حکومت کے لیے باعثِ شرم ہے مگر حکومت سے زیادہ ہم پر حرف آتا ہے کیونکہ

بہر حال بھگتنا تو ہمیں ہی پڑتا ہے اور بڑی حد تک ان کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ ہماری گندگی، غلاظت سے لاپرواہی، نفاست سے بیزاری، غفلت، قسمت پرستی، جہالت، بے ایمانی، کاہلی، بہانہ بازی اور فرائض سے مجرمانہ غفلت بیماریوں اور وباؤں کو پھیلانے کا اصل باعث ہیں۔

سماج اور افراد کی اس سے بڑھ کر مجرمانہ غفلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو تیل طاعونی چوہوں کو جلوانے کے لیے ہمارے اختیار میں آتا ہو اس میں سے پیسے کے پیسے گھریلو استعمال کے لیے لیے جائیں اور گھر کا خرچ چلانے والے خوش ہوں کہ انھیں چند روپیوں کی کفایت ہوئی! یہ فرضی اتہام یا غیر معتبر الزام نہیں بلکہ بالکل سچا اور طاعون کے "سنہرے دور" کا عام تجربہ ہے۔ اگر ہندستان کی سماجی ذہنیت اتنی پست نہ ہوتی اور ایسے ناجائز اور خطرناک استحصال کو گوارا نہ کرتی تو وباؤں کا زور آدھے سے زیادہ ٹوٹ گیا ہوتا۔

میرا مقصد حکومت کو اس کے حصۂ الزام سے چھٹکارا دلانا نہیں ہے اور نہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندستان میں بیماریوں کی کثرت اور وباؤں کی شدت سے مرکزی، صوبائی، ریاستی اور مقامی حکومتیں بری الذمہ ہیں بلکہ میرا اصل مقصد عمرانیاتی نقطۂ نظر سے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ

> سماج تمام خوبیوں اور برائیوں کا سرچشمہ ہے جس طرح
> تمام بھلائیوں کا سہرا سماج کے سر ہوتا ہے اسی طرح
> تمام برائیوں کی ذمہ داری سب سے زیادہ اور
> سب سے پہلے سماج پر عاید ہوتی ہے۔ اگر حکومتیں خراب
> ہیں یا غافل ہیں تو بھی یہ سماج ہی کا قصور ہے کیونکہ
> ہر قوم کو ایسی ہی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہو!

یہاں فلسفیانہ اور نظری مباحثوں کی تشریح نہیں ہو سکتی البتہ یہ بتانے کے لیے کہ

ہندستان کو "جراثیم کا مہاساگر" بنانے میں لوگوں کا کتنا حصہ ہے، چند مثالیں دی جاتی ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے بالکل ابتدائی زمانے کے کسی میدانِ جنگ پر مخالف فوجیں سبقت کے انتظار میں ڈیرہ ڈالے ہوئی تھیں۔ یوں ہی مسلمانوں کی تعداد کم اور فوجی حالت اور کیفیت مخدوش تھی، اس پر وبا کی نئی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ چند لوگ وبا کے ڈر سے فرار ہو گئے باقی بھاگنا چاہتے تھے یا یہ کہ کافی لوگوں کے متعلق یہ گمان ہو سکتا تھا کہ وہ بھی وبا سے ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ حالت نازک تو تھی ہی، خطرناک ہو گئی۔ ایسی صورت میں حکم دیا گیا کہ

"وبا سے ڈر کر بھاگنا جائز نہیں۔"

لوگ ٹھہر گئے، اور ایک زبردست خطرہ، جس سے مسلمانوں کو سخت ترین نقصان پہنچ سکتا تھا، جاتا رہا۔

اب سے تیرہ چودہ سال پہلے کا بالکل سچا قصہ ہے کہ حیدرآباد کی راجدھانی میں پھر ایک بار طاعون کا راج ہو رہا تھا، مرگھٹوں اور قبرستانوں میں چوبیسوں گھنٹے "رونق" رہتی تھی، آنے جانے اور مُردوں کو گاڑنے اور جلانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا البتہ سیکڑوں یا ہزاروں کا مجمع کسی مُردے کے ساتھ نہیں ہوتا تھا صرف چار پانچ آدمی رہتے تھے جو محبت، انسانیت یا لالچ سے مُردے کی آخری خدمت بجا لاتے تھے۔ شہر کے اکثر محلّے ویران تھے، لوگ شہر سے باہر جھونپڑیوں میں پناہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ مسلمانوں کے خاص محلّوں میں البتہ چند خاندان اسی حکم کی اطاعت میں کہ "وبا سے ڈر کر بھاگنا منع ہے" اپنے طاعون زدہ محلّوں سے نہیں نکل رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو سمجھایا گیا کہ مذہب انسان کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے اگر مذہبی احکام میں لچک نہ ہو تو انسان تباہ ہو جائے! جو ہدایت ایک خاص موقع کے لیے سرتاپا عقل اور مصلحت پر مبنی تھی ہم پر منطبق کی جائے تو خودکشی کا حکم بن جاتی ہے۔ ہمارے رہنما رحمتِ عالم تھے ان کی اور ان کے توسط سے آئی ہوئی ہر ہدایت ہمیشہ

ہمارے فایدے ہی کے لیے ہوسکتی ہے! وہ پھر بھی نہ مانے اور مذہب سے زیادہ اپنی ہٹ پر قائم رہے! جب انھیں منطق کے اصولوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ خاص اصولوں کو عام کیفیت پر منطبق کرنا اور سیاق عبارت سے علٰحدہ کرکے جُملے کو پیش کرنا یا پس منظر کو نظر انداز کرکے کسی واقعہ پر غور کرنا کج فہمی ہے تو بھی وہ رضامند نہ ہوئے۔ آخر میں ان سے کہا گیا کہ انسان پاپی ہوتا ہے، ہزاروں گناہ کرتا ہے، اللہ مہربان ہے، لاکھوں گناہوں کو بخشنے والا ہے کیا وہ آپ کے اس "گناہ" کو نہیں بخشے گا؟ آپ اپنی خاطر نہیں تو اپنے بیوی بچوں اور بہو بیٹی کی خاطر اس خطرناک محلّے سے نکل چلیے....

تیسرے روز وہ مر چکے تھے اور ان کا اکلوتا جوان بیٹا بھی اسی مرض میں مبتلا تھا اور چند روز بعد وہ بھی اپنے بیوی بچّوں کو چھوڑ کر چل بسا! آج بیوہ عورتوں اور یتیم بچیوں کا سہارا حکومت کے جبری بیمے کی بدولت حاصل ہونے والی آمدنی اور حکومت کے وظیفے ہیں، جو سراسر رعایتی اور بہت ہی کم ہیں۔ مسلمان گھرانوں کی یہ تنہا مثال نہیں ہے، سیکڑوں نہیں ہزاروں گھرانے مذہب زدگی اور جہالت میں مبتلا ہوکر فنا ہو گئے اور لاکھوں افراد قبل از وقت موت کا شکار ہوئے۔ ان کی موت فطری موت نہیں تھی، بلکہ ملک الموت کی خدمت میں جہالت کا نذرانہ تھا۔ ان کی موت خودکشی تھی، ایک تارک الدنیا یا آدم بیزار یا رنجور و بیمار انسان کی قابلِ معافی خودکشی نہیں بلکہ جہالت اور رعونت میں مبتلا ہوئے آدمی کی قابلِ نفرت خودکشی!!

ایسے ہی لوگ مرض کا شکار اور مرض کے پھیلانے کا ذریعہ ہوتے ہیں! ان میں سے اکثر کاہلی اور بے حسی کو چھپانے کے لیے یہ تاویل کرتے ہیں کہ "موت اٹل ہے، موت کا وقت اٹل ہے، جس کی جو موت ہوتی ہے، وہی موت انسان مرتا ہے!" گویا شہادت سے لے کر پھانسی تک موت کی جتنی قسمیں ہیں سب معینہ اور مقررہ ہیں جس میں رتی برابر فرق نہیں آسکتا! جسے حرام موت مرنا ہے وہ حرام موت مرے گا، جسے ہیضہ اور چیچک یا حادثے یا سولی سے مرنا ہے وہ اسی طرح مرے گا۔ ہندستان میں

کروڑ ہا لوگ یہ اور اسی قسم کے گمراہ کرنے والے خیالات رکھتے ہیں جس کی وجہ سے دباؤں کے پھیلنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس عقلِ سلیم اور علمی نقطۂ نظر سے وہی موت اٹل تصور کی جاتی ہے جو انسانی کوششوں اور تدبیروں کے باوجود واقع ہو یا جسے ٹالنے کی کوئی تدبیر ہمارے زمانے کے لوگوں کو نامعلوم ہو۔

اگر کھیل کود میں کوئی شخص اتفاق سے اس بُری طرح چوٹ کھائے کہ مرہم پٹی کے باوجود وہ مر جائے تو بے شک موت اٹل ہے؛ اگر بڑھاپے میں کوئی شخص بظاہر معمولی بیماری میں چل بسے تو بے شک موت اٹل ہے؛ اگر شہر کو معقول معیار پر صاف رکھنے اور خاص کر کھانے پینے کی چیزوں کی صفائی کا حتی المقدور عمدہ انتظام کرنے کے باوجود چند لوگ میعادی بخار میں مبتلا ہو کر مر جائیں تو بھی موت اٹل معلوم ہوتی ہے، مگر یہ ماننے کے لیے میں ہرگز تیار نہیں کہ سیاسی مجرموں کی سولی اٹل ہے، حکومتی بدانتظامی سے قحط سے بھوکوں مرنے والوں کی موت اٹل ہے، بے روزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرنے والے نوجوانوں کی موت اٹل ہو سکتی ہے! دنیا میں رہنے کی آرزو رکھنے والے شخص کا بے روزگاری کی وجہ سے تنگ آکر خودکشی کرنا یا فاقے کرتے کرتے نڈھال ہو کر مر جانا فطری موت نہیں بلکہ بے سولی کی سزائے موت ہے!

ہندستانی اپنی برائیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کے لیے دو وجوہ بار بار اور بڑی شدت سے پیش کرتے ہیں: ایک تو سیاسی مجبوری اور دوسرے افلاس۔ چنانچہ متعدد بیماریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "ہندستان مفلس ہے، وہ دباؤں کو کیونکر دُور کر سکتا ہے؟" اس میں شک نہیں کہ خاندانوں یا محدود جماعتوں کی حد تک افلاس کا عذر صحیح ہے مگر عام طور پر ہر وبا اور اس کے اثرات کو افلاس کا نتیجہ قرار دینا سراسر دھاندلی اور بہانہ بازی ہے۔ افلاس اور بیماریوں یا مفلسی اور وباؤں میں جو قریبی بندھن ہے اس سے میں انکار نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کے لازم و ملزوم ہونے یا وباؤں کو زیادہ تر افلاس کے سر تھوپنے کا مخالف ہوں۔

بڑے بڑے امیروں، جاگیرداروں، عہدہ داروں، سیٹھ ساہوکاروں، زمین داروں اور سرمایہ داروں کے گھروں میں جتنی گندگی ہوتی ہے وہ تو "افلاس" کا نتیجہ نہیں ہوسکتی؟ جہاں دس پندرہ جھونپڑیاں پڑ جاتی ہیں، یا شہر کے نواح میں جہاں غریب لوگ اپنے کچے پکے مکان بنا لیتے ہیں وہاں غلاظت کو دفن کرنے کے لیے کیا افلاس مانع ہے؟ کوڑا کرکٹ اور گندگی کو دفن کر دینے کے لیے کیا چاہیے؟ کدال اور پھاوڑا! کیا غریبوں کے پاس یہ بھی نہیں ہوتا؟ اصل چیز ان کی لاپرواہی اور کاہلی ہے جو امیروں اور غریبوں، تعلیم یافتہ لوگوں اور انپڑھوں سب میں پائی جاتی ہے۔ غریبوں کے لیے غلاظت کئی صورتوں میں بہانا ہے اور آدھی سے زیادہ غلاظت محض تھوڑی سی محنت اور اہتمام سے دور کی جاسکتی ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ ہر غریب واڑہ غلیظ واڑہ بن کر جراثیم کی پرورش گاہ بن جائے۔ اگر غریب خود کچھ نہیں کرسکتے تو محلّے کے امیر لوگ یا کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ تو صفائی پر پیسہ خرچ کرکے جراثیم کو فنا کرنے میں مدد دے سکتے ہیں!

چند سال قبل ایک دیسی ریاست کے وزیر اعظم کی چہیتی بیوی کا انتقال طاعون میں ہوا تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی تھی کہ اتنے بڑے گھرانے میں ایسی بری موت! یہ معلوم کرکے اور بھی حیرت ہوئی تھی کہ جس گھر میں لاکھوں کے زیور اور ہزاروں کی روزآنہ آمدنی تھی، اسی گھر کی کچی اور کھلی موریاں گندگی کا بدترین نمونہ تھیں۔ مودی خانہ بالکل معمولی تھا جہاں چوہے آسانی سے پل سکتے تھے۔ صفائی کا معیار اتنا پست تھا کہ اس کو صفائی سے تعبیر کرنا صفائی کے لفظ کی توہین کرتا تھا۔ ان کا محل سارے محلّے کے لیے خطرے کا باعث بنا ہوا تھا۔ جب شہر میں وبا پھیلی تو لازماً یہ گھر بھی متاثر ہوا۔ چوہے مرنے لگے۔ گھر کے ملازموں کا نمبر آیا۔ چہیتی بیوی کی خادمہ اور ان کے باغیچہ میں کام کرنے والی مالن طاعون میں مبتلا ہوکر دنیا سے سدھاری۔ گھر کی حکمرانی کرنے والی کو سوائے گنڈے تعویذ کرانے کے اس وقت بھی صفائی کا

خیال نہ ہوا۔ آخر کار وہ خود اپنی جہالت کا شکار رہوئی ۔ جس ملک کی چھینی ملکہ اس نفرد تاریکی میں مبتلا ہوگی ، اس ملک میں بھی بیماریوں اور وباؤں کا راج نہ ہوگا تو اور کہاں ہوگا!

دُکھی بھارت یا سدا کا روگی ہندستان

دوسرا حصّہ

چند عبرت انگیز حالات

کوڑھ یا جذام

کوڑھ میں مبتلا افراد : ۱۴،۰۰،۰۰۰

ہندستان میں کوڑھ میں مبتلا لوگوں کی تعداد چودہ یا پندرہ لاکھ ہے جنھیں کھلے بندوں پھرنے کی ہمارے غلام ملک میں آزادی ہے ! نہ صرف گھومنے پھرنے کی آزادی بلکہ شادی بیاہ کی آزادی بھی اور ایسی معصوم ہستیوں کو دنیا میں لانے کی آزادی جن کی زندگی خود ان کے لیے وبالِ جان ہوگی ! اگر ہم اپنے ملک سے وباؤں کو دور کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے لازمی ہوگا کہ خطرناک اور گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو صحت عامّہ کا دائمی خطرہ بنے رہنے نہ دیں اور وہ تمام طریقے اور تدبیریں اختیار کریں جن کی بدولت ترقی پذیر یورپ نے ان وباؤں کو دور یا محدود کیا۔

چودہ پندرہ لاکھ جذامیوں کے لیے سارے ملک میں گنتی کے چند دواخانے ہیں جو زیادہ تر عیسائی تبلیغی انجمنوں کے قائم کردہ اور انھیں کی محنت و توجہ سے چل رہے ہیں۔

عیسائی تبلیغی انجمنوں کا یہ کارِ خیر ہر طرح قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہے۔ اسی قسم کا ایک دواخانہ حیدرآباد ریاست کے ڈچ پلی نامی قصبے میں قائم ہے جسے ریاست کی طرف سے مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔ وہاں کے ڈاکٹروں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ کئی مریض بہت قبل از وقت بھاگ جاتے ہیں اور چونکہ جبری علاج کا کوئی قانون نہیں لہذا بہت سے مریضوں پر ان کی محنت و توجہ رائیگاں جاتی ہے۔

تمام سنجیدہ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ تمدنی قانون سازی کے مسئلہ پر غور کریں اور یہ تصفیہ کریں کہ قانون نافذ کئے بغیر اور ان پر سختی سے عمل کروائے بغیر کیا صدیوں کی بیماریاں دُور ہو سکتی ہیں؟ کیا بیماریوں کی روک تھام کئے بغیر اور خاص کر یقینی معذور پیدا ہونے والوں کی تعداد کو کم کئے بغیر گداگری کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟

اندھے

اندھوں کی تعداد:

ہمارے ملک میں اندھوں کی تعداد کا اندازہ بیس لاکھ کے قریب ہے اور سب دکھیوں کی طرح ان کا بھی پرسانِ حال کوئی نہیں۔ چند سال قبل بنگال میں "اندھے پن کی انسدادی انجمن" قائم ہوئی ہے جو اندھوں کی دنیا میں امید کی روشنی پیدا کرنا چاہتی ہے اور اس مقصد میں کچھ کچھ کامیاب ہو رہی ہے۔

اس ممتاز انجمن کی طرف سے سالانہ رودادیں اور معلوماتی رسالے شایع ہوئے ہیں اس میں بار بار واضح کیا گیا ہے کہ ساٹھ فی صد اندھاپن قابلِ انسداد ہے یعنے جو لوگ اندھے ہیں یا غفلت، جہالت اور بغیر علاج کی وجہ سے آئندہ یقینی اندھے ہوں گے ان میں ساٹھ فی صد کی آنکھوں کی روشنی بچائی جا سکتی ہے۔

اندھے پن کی وجہیں بیان کرتے ہوئے گندی جنسی بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اکثر مرد آوارگی اور بدچلنی کی وجہ سے کسی نہ کسی گندی جنسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور

اپنی نفسانیت سے مغلوب ہوکر اپنی بیوی سے بھی ملتے ہیں بلکہ بعض تو شادی بھی کرتے ہیں ۔ اس کی وجہ سے اولاد میں جنسی بیماریوں کا اثر رہتا ہے اور اکثر ان اثرات کا شکار ہوتے ہیں ۔ ان میں سے بہتیرے مرض زدہ بچّے اندھے ہو جاتے ہیں ۔ اندھے پن کی روک تھام کے لیے علاج کے علاوہ قانون کے ذریعے جنسی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی خانگی زندگی ، خاص کر ازدواجی زندگی اور خواہشِ اولاد پر پابندیاں عاید کرنا پڑیں گی ۔ اگر ہم گذشتہ صدیوں کی طرح وجدانیت میں مبتلا رہیں اور کوڑھیوں یا گندی جنسی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی خواہشِ اولاد کا احترام کریں تو مستقبل میں بھی ہماری وہی دشواریاں رہیں گی جو گذشتہ زمانوں میں تھیں اور اب بھی ہیں ۔

ہماری قوم مرفہ الحال کبھی نہیں ہو سکے گی اگر وہ قابل انسداد افلاس کو جڑ سے اکھیڑنے کی کوشش نہ کرے اور قابلِ انسداد افلاس کو جڑ سے اکھیڑنے کے لیے لازمی ہے کہ تمام مہلک اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا لا علاج لوگوں کو مرض زدہ اولاد پیدا کرنے سے محروم کر دیا جائے اور شر انگیز بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو محدود علاقوں میں رہنے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ باصحت انسانوں کے لیے خطرہ کا باعث نہ بن سکیں ۔ تاوقتیکہ ہم اس قسم کی تدبیریں اختیار نہیں کریں گے بھیک منگوں کی تعداد کم نہیں ہو سکے گی ، سڑکوں اور شاہراہوں پر گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا ، خاص کر کوڑھی اور نک جھڑے نظر آئیں گے اور ہر سال لاکھوں مدقوق ، جذامی یا اور کسی طرح معذور یا اندھے بچّے پیدا ہوتے رہیں گے جو زندگی بھر بھگتے اور ہمارے وجدانیت زدہ پنچ تمدن کی تشہیر کرتے رہینگے ۔

ہمارے بعض رہنما بیماروں اور بیماریوں کے وجود سے انکار یا دونوں کے وجوہ سے چشم پوشی کرتے ہیں اور اپنے دل و دماغ کو بھول بھلیوں میں ڈالنے کے لیے وقت بے وقت اپنے تمدن کی بُرائی کرتے ہیں اس سے ان کا مقصد ، شہرت اور پروپگنڈا ، تو حاصل ہو جاتا ہے گر مصیبت زدہ ہندستان کے دکھیوں کی نہ تو تعداد کم ہوتی ہے اور نہ درد کم ہوتا ہے ۔ علم مرفہ الحالی کی حیثیت سے عمرانیات کا یہ فرض ہے کہ وہ حقایق کا

پتہ چلائے اور اس کا انکشاف کرے اور اس ناگوار فرض کی انجام دہی میں جو کچھ بھی اعتراض اور طعنے سننا پڑیں ان کے لیے پہلے ہی سے تیار رہے۔ تمدنی علوم کی خدمت کرنے والوں کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کو تمدن کی اصلیت سے واقف کرائیں تاکہ وہ اپنی تہذیب و شائستگی کی تباہ کُن برائیوں سے واقف ہوکر اصلاح کی خواہش کریں اور رفتہ رفتہ ایسی جماعت بنا سکیں جو اصلاح کا بیڑا اٹھائے اور اسے کامیاب بنائے۔ اصلاح کی خواہش کرنے والی ترقی پسند جماعت کے بغیر بڑے سے بڑا رہنما بھی ناکام ہوگا۔ ترقی پسند جماعت کے بنانے میں سب سے بڑا حصہ تمدنی علوم کا ہے اور ہوگا جو سیاست، سماج، نفس، معیشت، مذہب، اخلاق کے باہمی مسئلوں کا تجزیہ کرکے دوسروں کو باخبر اور متنبہ کرتے ہیں!

دِق

دِق سے مرنے والوں کی تعداد ...,...,۱۲ سالانہ

دِق ایک عالمگیر مرض ہے اور سماجی مرضیات یا عمرانیات کے نقطۂ نظر سے دِق کے تذکرے کی ضرورت نہ ہوتی اگر دِق کے پھیلنے کا کوئی تعلق سماج سے نہ ہوتا یا دِق کی کثرت و شدّت سے ہماری سماجی زندگی کے بعض ناقابلِ انکار حقیقتوں کا پتہ نہ چلتا۔ ہندستان کے لال صلیب نے متعدد پوسٹر شایع کئے ہیں جن میں واضح کیا گیا ہے کہ ہندستان کی سماجی رسمیں دِق کے پھیلانے میں کیا حصہ لیتی ہیں۔ لحاف یا رضائی سے منہ ڈھانپ کر سونا، ایک ہی تھالی یا رکابی سے کئی کئی لوگوں کا کھانا، ایک ہی چلم یا حُقّے سے ساری محفل کا مستفید ہونا اور سب سے بڑھ کر شخصی اور گھریلو گندگی! شخصی عادتوں میں بدترین عادت (جو بظاہر سارے مشرق کی امتیازی خصوصیت معلوم ہوتی ہے) جا بجا تھوکنا ہے، خاص کر ریلوے کے ڈبوں، مسافرخانوں، اور ہوٹلوں کے کمروں وغیرہ کو گندا کرنا۔ اپنے گھر کی گندگی ہی کافی بری ہوتی ہے مگر پبلک عمارتوں اور سب کے استفادے کی عام گاہوں [illegible] عام سواریوں کو

متاثر کرنا دس گنا سرا ہے کیونکہ نجی مکان کی گندگی سے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے خود گندے لوگ یا ان کے متعلقین خطرے میں مبتلا ہوتے ہیں مگر عام گاہوں اور عام سواریوں کو غلیظ یا متاثر کرنے سے غیر لوگ کوفت اور مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں ۔ ہندستان میں بیماریوں کی شدت کو کم کرنا اور وباؤں کو دور کرنا ممکن نہیں جب تک کہ ہماری سماج صحتِ عامّہ کے مفاد کو محسوس کرکے صاف پسند اور صفائی پر عمل پیرا نہ ہو! بیماریوں کو پھیلانے والی بری عادتیں سرکاری قانون کے بل بوتے دور نہیں ہو سکتیں! ان عادتوں کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سماج کا غیر تحریری مہا قانون ضروری ہے جو سب پر ہر وقت نگرانی رکھنے والا، بہکنے والوں کو بر وقت ٹوکنے والا، خطاکاروں اور قصور واروں کو حقارت سے دیکھ کر موثر سزا دینے والا ہوتا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندستان میں ہر سال دس بارہ لاکھ افراد دق سے مرتے ہیں اور ہر جگہ جہاں سخت پردے کا رواج لڑکیوں اور عورتوں کو جسمانی ورزش اور کھلی ہوا کی نعمتوں سے محروم رکھ رہا ہے، خاص کر متوسط حیثیت کے خاندانوں یا غریب گھرانوں میں، دِق کی نسوانی شرح اموات تگنی ہے۔ اگر ہماری قوم ترقی پذیر اور ترقی پسند ہو جائے تو صرف دق میں مبتلا ہو کر مرنے والوں کی تعداد ہی ہماری سماجی رسموں میں سدھار کروانے کے لیے کافی ہے: خاص کر بچپانی یا نو عمری کی شادیاں، یا سالانہ حمل یا زچگیاں، بلند معیارِ آرام سے غفلت اور پردہ لاکھوں کی توانائی اور جانداری کو صلب کر کے ان کے جسموں کو پیلی موت کی پرورش گاہ بنا دیتے ہیں۔

ایمان داری اور غیر جانب داری سے ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مشرقی سماج کی طرح مغربی سماج کی برائیاں دِق کے مرض کو پھیلاتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں اور لڑکیوں میں سگریٹ دھوانے کی بری عادت اتنی ہی عام ہے جیسے ہمارے ہاں مردوں میں۔ ایسی مثالیں بھی کسی طرح کم نہیں کہ عورتیں ایک ہی دن میں چالیس پچاس سگریٹ دھنک دیتی ہوں۔ شاہراہوں پر یا سینما ڈول اور رسٹوران یا کیفے وغیرہ میں یا عام محفلوں اور عوامی

سواریوں میں سگریٹ پینا مغربی تمدن میں عورتوں اور لڑکیوں کے لیے عیب نہیں رہا۔ اسی کے ساتھ شراب نوشی اور عیش پسندی خاص کر بڑی رات گذرے تک دھویں دار کمروں میں ناچتے رہنا دق میں مبتلا کرنے والے یا دق کے قریب تر پہنچانے والے مغربی تمدن کے ذریعے ہیں!

اگر "سدھار" کے معنے مشرقی برائیوں کی بجائے مغربی برائیاں قبول کرنا ہے، اگر اصلاح سے مشرقی تمدن کو مغربی تمدن سے بدلا جانے والا ہے تو ہمیں ایسی تجدید سے دور ہی رہنا چاہیے! اگر تمدن کو قبل از وقت یا تکلیف دہ موت کا باعث بننا ہی ہے تو وہ تمدن ہمارا ہی ہو تو کیا برا ہے۔ فرض غرض سے ایک اور بری چیز اختیار کر کے آخر کار وہی موت مرنا کہاں کی عقلمندی ہے!

قحط اور قحط کی سنجوگی بیماریاں

بنگال کے موجودہ مہا قحط نے پھر ایک بار دنیا کو ہندستان کے دائمی خطرے کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور مصیبت زدہ ہندستان کی دکھ بھری کہانی مختلف محفلوں، مجلسوں اور حکومتی اداروں میں سنائی جارہی ہے اور چار و ناچار ان لوگوں کو بھی سننا پڑ رہی ہے جو نسلی رعونت، سائنسی گھمنڈ، مذہبی غرور اور اعلےٰ انتظامی قابلیت کی بدہوشی میں یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ترقی پذیر یورپ نے ہندستان کے گوناگوں مسئلوں کو حل کر دیا۔ خاص طور پر سائنسی گھمنڈ سے سرشار ہو کر کہا جاتا تھا کہ ریلوں کی ایجاد اور رواج نے قحط کو ملک بدر کر دیا۔ کروڑوں درسی کتابوں کے ذریعے نئی روشنی کی برکتیں گنائی جاتی تھیں اور ہر سبق میں ریلوں کا ذکر اور قحطوں کے خاتمے کا بیان ہوتا تھا۔ بے شمار سرکاری روئدادوں، تذکروں اور سرکاری محفلوں میں اس خیال کا پرچار کیا جاتا تھا اور سرکار پسند مباحثوں میں بار بار یہی دہرایا جاتا تھا اور یہ تک کہا گیا تھا کہ یہ لوگ احسان فراموش ہیں؛ یورپ کی نیکیوں سے فایدہ اٹھا رہے ہیں مگر

مانتے نہیں ہیں ۔ یورپ کی گوری نسلوں نے بقیہ تمام نسلوں کو مہذب اور شائستہ بنانے کا اخلاقی بار اٹھایا ہے اور خاص کر اپنے زیر اثر علاقوں کے رہنے والوں کو خوش حال بھی بنا رہی ہیں ۔ یہی کیا کم بات ہے کہ محض ریلوں اور دخانی جہازوں کی وجہ سے بھوکوں مرنا محال ہے ۔ بیسیوں نام نہاد محققوں نے اپنے تحقیقی اور تفتیشی مقالوں اور مضمونوں میں انھی باتوں کو بار بار اور نئے نئے پیرایوں سے موقع بے موقع دہرایا ہے اور ایسے بھی کئی عالم تھے اور ہیں جنھیں علم و واقفیت کے باوجود یا بے تحقیق کئے یہ کہتے یا لکھتے شرم نہ آئی کہ زرین عہد کی تیز رو سواریوں نے قحط کو نابود کر دیا ہے !

جب عالموں اور محققوں کا یہ رویہ ہو تو پھر غریب مس مے یو کی کیا شکایت اگر اس نے لکھ دیا کہ

"ریلوں کے وجود کا ایک اثر یقیناً یہ ہوا کہ ہندستان[ل] سے قحط کا خطرہ ہٹا دیا گیا"۔

One Effect of the existence of the railroads has certainly been to to wipe out the terror of famine in India

اس جملے کو لکھے ہوئے پندرہ سال بیت گئے اور اس دوران میں بھی ہر سال ملک کے کسی نہ کسی حصے میں انتہائی گرانی ہوتی رہی ، ہر دوسرے تیسرے برس کسی نہ کسی علاقہ میں قحط پڑتا رہا ، لوگ اور ان کے مویشی بھوک سے تڑپ تڑپ کے مرتے رہے مگر

ل ۔ جرمنی میں ریلوں کی طرف سے ایک خصوصی رسالہ شایع ہوتا ہے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رسالے میں ہندستانی ریلوں پر ایک طویل مضمون ۱۹۲۶ء میں شایع ہوا تھا ۔ اس مضمون میں بھی اسی قسم کے بے بنیاد دعوے کئے گئے تھے ۔ پروپگنڈا علم اور تحقیق کو بھی مسخر کرتا ہے ! ورنہ جرمنوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ انگریزوں کے گیت گاتے ۔ اصل یہ ہے کہ وہ خود نسلی رعونت اور مسلسل پروپگنڈے کا شکار ہوئے ہیں رسالے کا نام۔ **Archiv fur Eisenbahn wesen**

حکومتی حلقوں میں (ان سے زیادہ حکومت پسند اور حکومت پرست محفلوں میں) ان ناگوار باتوں کو بالکل نظرانداز کیا جاتا رہا۔ البتہ کبھی کبھی سرکاری افراد یا اداروں نے خانگی یا نیم سرکاری طور پر اعتراف بھی کیا تھا کہ قحط کی وجہ سے شدید مصیبت پڑ رہی ہے اور جانوں کا نقصان بھی ہو رہا ہے۔ حکومت سے وابستہ اخباروں اور رسالوں میں بھی اس قسم کی خبریں شایع ہو جاتی تھیں اور گاہے ماہے اخباروں کے اڈیٹر اڈیٹوریل لکھ کر اپنا قومی اور اخلاقی فرض ادا کر کے برس چھ مہینے کے لیے "منصبی فرائض سے سبکدوش" ہو جاتے تھے۔

آخرکار گذشتہ زمانوں کی بدترین مصیبتوں کی طرح پھر ایک بار بنگال کا مہا قحط شروع ہوا، پھر ایک بار ہندستان کے لیے دنیا میں بھیک مانگی گئی، متعدد نیک اور وجدانیت زدہ افراد اور جماعتوں کی طرح امیرا ور غریب قوموں نے قحط زدہ ہندستان کی مدد کی۔ آئرستان اور چین، امریکہ اور آسٹریلیا، سعودی عرب اور نیپال سے خیراتی اور مصلحتی چندے وصول ہوئے۔ ان چندوں کی فہرست میں سعودی عرب، چین اور آسٹریلیا کے نام دیکھ کر اچنبھا ہوتا ہے کہ جو لوگ خود ہماری طرح کنگال ہیں اور ہماری طرح مصیبتوں میں مبتلا ہیں، احسان جتانے کے لیے چندے دیتے ہیں یا بزرواُی سرمایہ داروں کی طرح جنھیں لوٹتے ہیں ان کی امداد کی خاطر چندے بھی دیتے ہیں مغربی آسٹریلیا کی طرف سے بنگال کے آسٹریلیائی گورنر کیسے صاحب کو بنگال قحط فنڈ کے لیے ایک ہزار پاؤنڈ بھیجے گئے۔ چین کا ایک بڑا صوبہ قحط زدہ ہونے کے باوجود چینی حکومت نے ہندستان کی امداد میں لاکھ سوا لاکھ خرچ کیا[1]۔ جس وقت ہندستان کو یہ امداد بھیجی گئی چین کے بین اقوامی امدادی کمیشن کے معتمد نے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ

> "اس صوبے کے دس لاکھ آدمی قحط اور اس کی سنجوگی بیماریوں سے مر چکے ہیں اور ہمیں ایک بدتر مستقبل کا مقابلہ کرنا ہے۔"

---

[1] اخباری اعلانوں میں اختلاف تھا۔ بعض نے ایک بعض نے سوا لاکھ لکھا تھا۔

قحط زدہ بنگال کے علاوہ ہندستان کے اور بھی حصے قحط میں مبتلا ہوئے، اور خاص کر آسام اور مالابار سے تشویش ناک اطلاعیں پہنچتی رہیں۔ اور ان کا چرچا دنیا بھر میں ہونے لگا۔ عالمگیر اطلاعوں کے بعد انگلستان کی مرکزی حکومت کو اور سرکار کے مداح حکومتی اخباروں کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ ہندستان میں قحط پڑا ہے۔ شرماشرمی سے بعض اخباروں نے مصیبت زدہ افراد اور گھرانوں کی تصویریں بھی چھاپیں اور ان کے بارے میں اداریے بھی لکھے اور سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا کہ قحط کی وجہ سے موتیں ہو رہی ہیں۔

قحط کی وجہ سے لوگ صرف بھوکوں نہیں مرتے بلکہ قحط زدہ آبادی فاقے کرتے کرتے چونکہ نڈھال ہو جاتی ہے اور صرف ناکافی اور گھٹیا قسم کی غذا کھانے پر مجبور ہوتی ہے اس لیے بہت سے لوگ معمولی معمولی بیماریوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ انگلستان کی مرکزی حکومت کے وزیرِ ہندستان نے سرکاری بیان میں اعتراف کیا ہے کہ

"۱۶؍اگست ۴۳ سے ۱۱؍دسمبر تک کلکتہ کے ہسپتالوں میں ۱۶،۲۸۵ ادھ موئے داخل ہوئے جن میں سے ۶،۱۳۶ مر گئے۔ ان کے علاوہ ۱؍اگست ۴۳ سے ۱۱؍دسمبر ۴۳ تک پولیس یا غیر سرکاری انجمنوں کی طرف سے نپٹائی ہوئی لاشوں کی تعداد ۹،۲۱۶ تھی جن میں ممکن ہے ایسی موتیں بھی شامل ہوں جو بھوک کی وجہ سے نہیں ہوئیں۔"

اسی بیان میں وزیرِ ہند نے یہ بھی اعتراف کیا کہ

"۲۷؍جون ۴۳ اور ۱۳؍نومبر ۴۳ کے درمیان بنگال میں ہیضے کی وجہ سے ۸۳۹،۷ موتیں ہوئیں۔"

ان اعداد کا خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ مہینوں میں کلکتہ کے ہسپتالوں میں روزانہ ۲ ۵ افراد مر رہے تھے اور اس کے علاوہ کلکتہ کی شاہراہوں یا گلی کوچوں پر پائی جانے والی لاشوں کی روزانہ اوسط تعداد ۶۹ تھی گویا بنگال کے موجودہ مہاقحط میں (سرکاری بیان کے بموجب) صرف صوبے کی راج دھانی میں روزانہ ۱۲۱ افراد بیسویں صدی کی تنظیم اور "قحط کو ناممکن بنانے والی ریلوں" کے ہوتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے رہے اور ایسی بے موت مرے کہ پرانے زمانوں کے بدقسمت افراد کی یاد تازہ ہو گئی!

سارے صوبے میں یا بقیہ ہندستان میں قحط اور بھوک سے کتنی جانیں ضایع گئیں یا جا رہی ہیں اس کا علم جنگ کے برسوں بعد تک کسی کو نہیں ہو سکے گا اور اس وقت بھی نہ معلوم تمام اطلاعیں یکجا کی جا کر شایع بھی کی جاتی ہیں یا ہر حکومت کانٹ چھانٹ کر کے مرکزی حکومت کو بھی ٹھیک طور پر باخبر نہیں کرتی! موجودہ زمانے کی قحط اور اس کی سنجوگی بیماریوں کی شدت اور وسعت کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نوکھالی ضلع کے انگریز کمشنر نے ایک دربار کے موقع پر کہا کہ
"ضلع کی چالیس ہزار سالانہ اموات کے مقابلے میں گذشتہ
سال (۱۹۴۳ء میں) ستر ہزار موتیں ہوئیں"

کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ انسانیات کے صدر پروفیسر چٹو پدھیا نے آٹھ ضلعوں کی سروے کے بعد اندازہ کیا ہے کہ

"قحط سے کم و بیش دو تہائی تعداد متاثر ہوئی ہے اور
ہر سال معمولاً واقع ہونے والی موتوں کے علاوہ اندازاً تیس
پینتیس لاکھ موتیں ہوئی ہوں گی"

ان ہی کا خیال ہے کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی شرح بہت زیادہ تھی، کہیں دوگنی اور کہیں اس سے بھی زیادہ۔ پروفیسر چٹو پدھیا نے صحیح لکھا ہے کہ زیادہ مردوں کے مرنے کی وجہ سے کماؤ لوگوں کا رہا سہا سہارا بھی جاتا رہا اور کنبے کے کنبے بے وارث ہو گئے

جس کی وجہ سے کئی سماجی بُرائیاں نمودار ہوئیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں انسان فروشی اور بیسوا پن ہے۔

سارے بنگال کی بابت وزیر ہند نے برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ

"۱۹۴۳ء کے آخری پانچ مہینوں میں قحط اور ریا اس کی سنجوگی بیماریوں سے مرنے والوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہیں۔"

ہفتوں بعد وزیر ہند نے پارلیمنٹ ہی میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ

"... ۶،۸۹، افراد حالیہ قحط میں مرے"

غرض سرکاری، نیم سرکاری اور خلاف سرکاری بیانوں اور اطلاعوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قحط اور اس کی لازمی خرابیوں کی وجہ سے صوبۂ بنگال میں بیس بائیس لاکھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں اور موجودہ زمانے کی قحط کی شدت اور وسعت کا صحیح اندازہ جنگ کے بعد ہی ہو سکے گا مگر اس وقت تک حالات بہتر ہو چکے ہوں گے، قحط کی روداد پڑھنے کی کسی کو کیا غرض ہوگی اور عوام کی بہتر حالت سے فایدہ اٹھا کر ریلوں کی عالم آشکارا برکتوں کا پھر ذکر ہوا کرے گا: درسی کتابوں میں اعلیٰ مضمونوں میں، تحقیقی مقالوں میں، سرکاری رودادوں میں اور سب سے زیادہ صاحب سے زیادہ صاحبیت پر فریفتہ ہندستانی حلقوں میں!

یم دیوتا کے چرنوں پر بھارت ماتا کی بھینٹ
یعنی
ملک الموت کی خدمت میں ہندستان کا نذرانہ

۱۹۲۱ کے گنادے کی سرکاری روداد میں دی ہوئی شرح کے مطابق اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال ہندستان میں ہیضے، چیچک اور طاعون جیسے قابلِ انسداد بیماریوں میں مبتلا ہو کر مرنے والوں کا

تعداد تقریباً چھ لاکھ سالانہ ہے۔

عمرانیات کی رائج کردہ اصطلاحوں میں سے ایک اصطلاح Preventable deaths (قابلِ انسداد موت) ہے۔ یہ اصطلاح علمی اور تحقیقی حلقوں کے علاوہ اچھے پڑھے لکھے حلقوں میں بھی استعمال کی جانے لگی ہے۔ ہر جاندار کو ایک نہ ایک روز مرنا ہے۔ پھر "قابلِ انسداد موت" کے کیا معنے؟ اس کے معنے ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اور یا ایسی وجہوں سے مرنا ہے جنھیں انسانی عقل، تدبیر اور دریافت کردہ طریق کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہیضہ، چیچک، طاعون جیسی بیماریاں یا فاقے، قحط سب اسی نوعیت کی وجہیں ہیں۔ جب سے مغرب میں تہذیب کا پرچم لہرانے لگا ہے قحطوں اور وباؤں کی عملداری صرف مشرق تک محدود ہو گئی ہے اور انھوں نے خاص کر چین اور ہندستان میں بسیرا کیا ہے۔

گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں جتنے قحط واقع ہوئے اور جتنی مرتبہ وبائیں پھیلیں، اور ان میں مبتلا ہو ہو کر جتنے لوگ فنا ہو گئے، اس سے حساب لگایا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر سال دس لاکھ قابلِ انسداد موتیں ہوتی ہیں۔ یہ تعداد گویا فرشتۂ موت پر ہندستان کی طرف سے انسانوں کی قربانی ہے۔ "اشرف المخلوقات" کے لیے کیسی قابلِ فخر قربانی!

یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ اندازہ بالکل بے بنیاد نہیں میں صرف ہیضے سے واقع ہونے والی موتوں کا معتبر حوالہ دیتا ہوں۔ ۱۹۴۱ کے گناوے کی سرکاری روداد کے مطابق ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۹ کی دو دہائیوں میں چالیس لاکھ افراد صرف ہیضے کی وجہ سے قبل از وقت موت کا شکار ہوئے۔ انھیں موت نہیں آئی تھی، انھیں ہندستان کے راج اور سماج نے مارا تھا۔

سرکاری اعداد کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید محمود نے اکتوبر ۴۴ کے ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ ۱۹۴۴ کے جنوری سے جولائی تک دو لاکھ افراد ہیضے میں مبتلا ہو کر مر چکے اور ان دنوں بہار وبائی مصیبت میں گرفتار ہے۔ کیا وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب ہندستان بھی یورپ اور امریکہ کے ترقی پذیر ملکوں کی طرح گھناؤنی بیماریوں اور قابلِ نفرت وباؤں سے محفوظ رہے گا؟

ہندستان کی شماریاتِ آبادی

اور

اُس کی عمرانیاتی تشریح

شرح پیدائش، شرح اموات اور شرح بقا

ترقی کا مقصد حیات طبعی حاصل کرنا ہے۔ انسان کی عمر کا اندازہ "تین بیس اور دس" ٹھیک کیا گیا ہے۔ وہ زندگیاں جو چوتھائی صدی گذارنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں بیکار جاتی ہیں۔ جو لوگ نوجوانی سے پہلے ہی گذر جاتے ہیں اپنے مقصد حیات کو بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ ان کا وجود اور پیدائش طبعی، معاشی، روحانی، سماجی اور نفسیاتی اعتبار سے بیکار بلکہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا پیدائش کا مقصد بقا ہے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ پیدائش کے بعد کتنے لوگ بچتے، کماتے، اور دنیا سے تھوڑا بہت لطف اٹھا سکتے ہیں۔

ہندستان میں فی ہزار افراد سالانہ ۳۴ بچے پیدا ہوتے مگر ۲۴ افراد مرجاتے ہیں لہٰذا شرح بقا ۱۰ ہوتی ہے

جاپان ″ ″ ″ ۳۲ ″ ″ ″ صرف ۱۸ ″ ″ ″ ″ ۱۴ ″

کینیڈا ″ ″ ″ ۲۴ ″ ″ ″ ″ ۱۱ ″ ″ ″ ″ ۱۳ ″

امریکہ اور برطانیہ میں شرح پیدائش بھی کم ہے اور شرح اموات اور بھی کم لہذا نسبتاً وہاں کی شرح بقا بھی زیادہ ہے۔ ہندستان میں پیدائش کی شرح زیادہ ہے تو موتوں کی بھی کثرت ہے

جہاں موت کا بازار اس قدر گرم رہے وہاں پیدائش کی کیا خوشی!
اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ کم بچے پیدا ہوں اور زیادہ لوگ زندہ رہیں۔
کم سنی کی شادی، تہی دستی، اصول حفظان صحت کی ناواقفیت کے
ہاتھوں نہ صرف معصوم بچے بلکہ غریب مستورات بھی بہ کثرت ضائع ہو رہی ہیں۔"

آپ کو شاید گمان ہوگا کہ یہ الفاظ کسی ضبط تولید کے حامی، امریکیت کے پرستار، مغربیت کے شیدائی کے ہیں یا کسی انگریز ڈاکٹر یا مدبر، فلسفی یا مصلح معاشرت کے! آپ کو معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ یہ الفاظ ایاس برنی صاحب جیسے مشرق دوست اور محتاط نویس کے ہیں! گیان چند جیسے واقف کاروں نے صاف صاف لکھ دیا ہے

ہندستان کی آبادی اس کی	India's population is in
ضرورتوں اور صلاحیتوں سے	excess of her needs and its
زیادہ ہے اور اس کو روکنا	growth must be checked.
لازمی ہے۔	

ہندستان میں بچکانی اموات

نظام فطرت کے مدعی، قدامت کے پرستار، ضبط تولید کے مخالف، صداقت کے مبلغ کیا یہ جانتے ہیں کہ ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور ترقی پسند ملکوں اور جماعتوں میں بچکانی اموات کی کیا شرح ہے؟ اور ان کے مقابلے میں ہندستان کے "معصوم بچے اور غریب مستورات" کس کثرت سے ضائع ہو رہی ہیں!

انگریزی کا ایک لاجواب فقرہ ہے : Ignorance is bliss!

جہالت برکت ہے

ہمارے ملک کے قدامت پرستوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ

آسٹریلیا میں ۱۰۰۰ پیدائشوں میں ۳۸ بچکانی موتیں ہوتی ہیں

متحدہ امریکی ریاستوں میں	″	″	″	۵۴
انگلستان	″	″	″	۵۸
جاپان	″	″	″	۱۰۶
ہندستان	″	″	″	۱۶۰

ہندستان کے متعلق جدید ترین روئداد میں گذشتہ تیس سال کے اعداد دیئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

سنہ ۱۹۱۲ء میں بچکانی اموات کی شرح ہزار پیدائیشوں پر ۱۹۵

سنہ ۱۹۲۱ء	میں	۱۹۸
سنہ ۱۹۲۵ء	″	۱۷۴
سنہ ۱۹۳۰ء	″	۱۷۸
سنہ ۱۹۳۴ء	″	۱۸۷
سنہ ۱۹۳۹ء	″	۱۵۶

اس سے کم شرح نہیں ہے ۔ گویا امریکہ اور انگلستان کے مقابلے میں ہمارے ہاں بچے تگنی تعداد میں ضایع جاتے ہیں ۔ اگر ہمارے ملک میں پارسیوں اور عیسائیوں کے علاوہ بعض ترقی پسند جماعتیں نہ ہوتیں اور سارا ہندستان ضبط تولید کے مخالفوں یا [illegible] فطرت کے بلبلوں سے بھرا ہوتا تو یہاں کی بچکانی شرح چوگنی بلکہ پانچ گنی ہوتی

موٹروں اور دوسری تیز رفتار سواریوں کی وجہ سے آئے دن ہونے والے

حادثوں میں جانی نقصان پر آنسو بہانے والے پہلے تو یہ دیکھیں کہ ہندستان میں معصوم بچوں کی جانی نقصان کا کیا ٹھکانہ ہے!

ہندستانیوں کی اوسط عمر

سماج کا اثر صحت پر پڑتا ہے، معیشت اور سیاست سے صحت متاثر ہوتی ہے۔ اگر سماجی رسمیں بچپن کی شادی یا ابتدائی نوجوانی ہی میں ازدواجیت کی موافق ہوں یا لاعلاج اور گندی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی شادی پر روک تھام یا ممانعت نہ ہو اور غربت کی وجہ سے ماؤں اور بچوں کو ناکافی اور ناقص غذا میسر ہو تو قومی صحت کا معیار گھٹ جاتا ہے، اموات شرح زیادہ ہوتی ہے، بچے بہت مرتے ہیں، بیماریاں زیادہ پھیلتی ہیں، وبائیں جلد جلد آتی ہیں، معمولی بیماریوں میں انسان بہت زیادہ مدت تک مبتلا رہ کر بھگتتا ہے اور ان سب کا نتیجہ اوسط عمر کی کمی میں نمودار ہوتا ہے۔

آسٹریلیا میں اوسط عمر	۶۷	ہے
سویڈن میں	۶۴	
انگلستان میں	۶۳	
جرمنی میں	۶۳	
جاپان میں	۴۷	
اور ہندستان میں	۲۷	

بعض ماہروں کے اندازے کم ہیں مگر ان کے مطابق بھی آسٹریلیا اور یورپ میں ۵۵ اور ہندستان میں ۲۲ اوسط عمر ہے۔ اوسط عمر کی کمی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری معاشی اور سماجی حالت سدھار کی کس قدر محتاج ہے

جب تک ہمارے ملک میں سماجی رسمیں نہیں بدلیںگی اور بچپن کی شادیاں یا

ابتدائی نوجوانی کی شادیاں بالکل بند نہیں ہونگی یا عورتیں بھی ہزاروں کی تعداد میں نرسنگ اور دائیوں کا شریفانہ پیشہ اختیار نہیں کرینگی ، گندگی کو دور کرنے کی سماجی تعلیم و تربیت نہیں دی جائیگی ہندستان کی صحت کا معیار بہتر ہونا ممکن نہیں ۔ انگلستان میں ... ۲۹ ڈاکٹر اور ... ۱۰۱ نرسیں ہیں اور ہندستان میں نرسوں کی تعداد صرف ۴½ ہزار ہے اور تقریباً سب کی سب غیر ہندو اور غیر مسلمان ۔ جب تک ہندو عورتیں اور مسلمان عورتیں ہزاروں کی تعداد میں ندامت اور پردے کو چھوڑکر نرسنگ اور دائیوں کے ضروری پیشے اختیار نہیں کرینگی ، ہماری صحت کا معیار گرا ہوا رہیگا اور یہ تعداد کبھی مہیا نہ ہوگی اگر سماج ان پیشوں کے اختیار کرنے میں حائل رہیگی ۔

ہندستانیوں کی اوسط عمر ۲۷ ہے مگر کروڑوں لوگ ۲۷ سے زیادہ کے ہیں ، کروڑوں ادھیڑ ہیں اور بوڑھے ہیں ! یہ کیا بات ہے ؟ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بچے کثرت سے ضایع جاتے ہیں لہذا مجموعی حیثیت سے اوسط عمر ۲۷ نکلتی ہے مگر زندگی کا پہلا سال اگر خیر سے بیت جائے تو خود ہندستانیوں کی اوسط عمر دیا ہر ایک ۔ ایک برس عمر والے بچے کی متوقع مدت حیات) ۳۴ ہو جاتی اور ۱۰ برس کا ہو جائے تو اس کی متوقع مدت حیات ۳۶ ہو جاتی ہے ۔ ہر ملک کے اعداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھوں کے مقابلے میں بوڑھیاں زیادہ ہیں ! رنڈوے کم ہیں ، بیوائیں زیادہ !

شماریات بتا سکتی ہے کہ آپ اور کتنے سال زندہ رہنے کی توقع کر سکتے ہیں ؟ یہ اندازہ ہر فرد پر صحیح نہیں آتا مگر مجموعی طور پر سب پر صادق آتا ہے ۔ مثلاً مختلف سو آدمیوں کو چن لیا جائے جن کی عمریں ساٹھ ساٹھ کی ہوں تو معلوم ہوگا کہ بعض ایک سال میں بعض انتقال بعد بعض دو سال میں اور بعض بارہ سال بعد مرینگے اور مجموعی طور پر ساٹھ سال والے مرد کی عمر ستر کی ہوگی ۔

آئندہ صفحے پر دیے ہوئے جدول سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کی عمر اور وطنیت کے لحاظ سے اس کی اوسط عمر یا بقیہ مدت حیات کتنی

ملک کا نام	پیدائش کے وقت متوقع اوسط عمر	ایک سال کی عمر ہونے کے بعد	دس برس کے بعد	بیس برس کے بعد بقیہ اوسط عمر	تیس	چالیس	پچاس	ساٹھ	ستر
نیوزی لینڈ	۶۵	۶۶	۵۸	۵۰	۴۱	۳۲	۲۴	۱۶	۱
سویڈن	۶۳	۶۵	۵۸	۴۹	۴۱	۳۲	۲۴	۱۶	۱
انگلستان	۶۰	۶۳	۵۶	۴۷	۳۸	۳۰	۲۱	۱۴	۸
کنیڈا	۵۹	۶۴	۵۸	۴۹	۴۰	۳۲	۲۳	۶	۹
جرمنی	۶۰	۶۴	۵۷	۴۸	۴۰	۳۱	۲۳	۱۵	۹
جاپان	۴۵	۵۱	۴۸	۴۰	۳۳	۲۶	۱۹	۱۲	۸
مصر	۳۱	۳۹	۳۸	۳۳	۲۸	۲۳	۱۸	۱۳	۹
ہندستان	۲۷	۳۵	۳۶	۳۰	۲۴	۱۸	۱۴	۱۰	۶

ان اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے انسان کی عمر ہر ملک میں "تین بیس اور دس" مقرر کی ہے اور ساٹھ برس کی عمر تک پہنچنے کے بعد ہر ملک میں اوسطاً زندگی کے آٹھ نو برس رہ جاتے ہیں۔ قدرت کے قانون کو بدلنا انسان کے بس میں نہیں مگر بہتر معیار زندگی، بلند تر معیار آرام، انسانوں کے شایان شان غذا اور انتظام صفائی، دیہات سدھار، سب کے لیے کھانے پینے، رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کے معقول ذریعوں کے انتظام، نیز بیماریوں کی انسداد اور علاجی تدبیروں سے ہم اپنے ملک کی اوسط عمر کو دونا کرسکتے ہیں اور لڑکوں اور نوجوانوں کی متوقع مدت حیات میں تیس تیس برس کا اضافہ کرسکتے ہیں۔

یہ جدول اس طلسم کو بھی فنا کردیتی ہے جسے غرض مند لوگ، لالچی ماں باپ، ہوس زدہ بوڑھے، اندھی وجدانیت سے گمراہ یا شماتت پرست افراد مانتے اور پھیلاتے ہیں، ساٹھا پاٹھا نہیں ہوتا بلکہ لب گور پہنچا ہوا عدم کا بچھڑا مسافر ہوتا ہے۔

ہندستانی سماج

پر

کلنک کے داغ

خود پسندی کے غرور اور روحانیت کے دل بہلاؤ تصور میں ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم میں کیسے کیسے عیب جمع ہوگئے ہیں جن کا دور کرنا ترقی کے لئے لازمی ہے۔ پستی اور غلامی اب سے سوا سو سال پہلے بالکل عام اور انسانیت کی متضاد رسمیں تھیں۔ مغربی تہذیب اور انگریزی حکومت کا یہ احسان ہے کہ ہندستانی تہذیب کے چہرہ پر سے یہ دو کلنک کے ٹیکے تو دور کردئے گئے۔ پھر بھی ہندستان کے داغ دار چہرے پر بڑے بدنما اور گھناؤنی داغ ہیں۔

انتہائی بے جوڑ شادیاں یا بچپن کی شادیاں، جس کا رواج اکثر دیسی ریاستوں میں عام ہے اور (شاردا قانون کے نفاذ کے باوجود اِ مختلف بہانوں اور تاویلوں کے تحت یا بد ایمانیوں اور بے توجہیوں کی وجہ سے) برطانوی ہندستان میں بھی مفقود نہیں؛ انتہائی سخت پردہ، لڑکوں اور عورتوں کی حق تلفی اور وراثت میں محرومی دوبارہ شادی کی ممانعت، طلاق کی ممانعت یا ہمت شکن مخالفت، ویلو داہی طریق ادقات کی آمدنی سے نفس پرستیاں، انتہائی جماعت بندی اور ذات پات کی [illegible]شیں، طبقہ واریت، فرقہ واریت، ملت پرستی، تعصب اور جہالت یہ اور اسی قسم کی کئی اور برائیاں ہندستان کے تمدنی چہرے کے بدنما اور گھناؤنی داغ ہیں۔ ان میں سب سے

زیادہ افسوس ناک

کمسن اور معصوم بیواؤں کا وجود

ہے ۔ صرف بھاؤنگر کی ریاست میں پانسو بچیاں اور لڑکیاں ہیں جن کی عمریں آٹھ، دس دس یا بارہ بارہ سال کی ہیں۔ کئی بچیاں ہیں جن کی عمریں ایک ایک سال کی بھی نہیں، اور وہ بیوہ ہوچکی ہیں ۔

ان بدقسمت ہستیوں میں بیسیوں ان "شریف" گھرانوں کی بہو بیٹیاں ہیں جہاں بیوہ کی دوبارہ شادی یا تو مذہب اور قانون دونوں اعتبار سے ممنوع ہے یا مذہبی اور قانونی اجازت کے ہوتے ہوئے سماج اور رواج کے لحاظ سے قطعی طور پر ناممکن یا انتہائی دشوار ہے ۔ ہندستان کے ہر حصہ میں اور آبادی کے تقریباً تمام فرقوں اور جماعتوں میں بیوہ کی شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے ! اور دوسری شادی کو شادی سے تعبیر ہی نہیں کیا جاتا بلکہ "دوسرا نکاح" یا دوسرا عقد کہا جاتا ہے اور "دلہن ایک بار، زچہ بار بار" کا مسلک ہندستان بھر میں تمام فرقوں اور طبقوں، نسلوں اور سماجوں پر مسلط ہے ۔

ایسے ملک اور زمانے میں جو دوسری شادی کو عملاً ناممکن بناتا ہو یہ اور بھی زیادہ برا ہے کہ بچپن کی شادیاں، کمسنی کی شادیاں یا انتہائی بے جوڑ شادیاں گوارا کی جائیں ۔ ایسی ہی شادیوں کی وجہ سے بیواؤں کی کثرت ہوتی ہے ۔ بچکانی اموات ہر جگہ زیادہ ہوتی ہیں اور ہر فرد کی عمر کا ابتدائی سال بہت خطرناک ہوتا ہے ۔ پہلا سال خیر وخوبی سے گذرنے کے بعد بھی ہر بچے کے لئے ابتدائی چند سال کافی خطرناک ہوتے ہیں اور اس مدت کو پار کرنے کے بعد زندگی کی متوقع مدت بڑھ جاتی ہے ۔ جو لڑکے کمسنی کی شادی کی وجہ سے رنڈوے ہو جاتے ہیں ان کی شادی دوبارہ کردی جاتی ہے مگر بیوہ بچیاں اور لڑکیاں زندگی بھر بیوہ رہنے پر مجبور کی جاتی ہیں چنانچہ اس وقت

ہندستان کے مختلف حصوں اور سماجوں میں ایسی دس ہزار بیوہ لڑکیاں ہیں جن کی عمریں چند مہینوں سے چند سال تک کی ہی ہیں ۔

یہ معصوم ہستیاں جب سنِ شعور کو پہنچینگی اور انھیں معلوم ہوگا کہ وہ بچپن ہی میں بیاہ دی جاچکیں اور "دیالو پرماتما کی اتینت کرپا" یا "خدائے بزرگ و برتر کی لامحدود مہربانیوں اور احسانوں" کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ ہوچکیں اور ہماری روح پرور سماج الٹا اُنہیں ہی منحوس یا قصور وار ٹھیرا رہی ہے اور زندگی بھر انہیں مصیبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا ہے تو ان کا دل کیا کہیگا ؟ وہ کس دل سے شکر گزار اور احسان مند ہونگی ؟ ان میں سے چند دل ہی دل میں خیال کرینگی کہ وہ ایسے جاہل ملک اور ظلم پسند سماج میں کیوں پیدا ہوئیں جہاں وہ سماج کے بنائے ہوئے اندھیر مندریں ظلم و جہالت کے دیوتا پر بھینٹ چڑھائی جارہی ہیں ۔ گوناگوں مصیبتوں سے مجبور اور ہمہ قسم کی ترغیبوں سے بے بس ہوکر ان کی عظیم اکثریت بدنام گھروں میں پہنچ جائیگی ۔ پھر ایک بار اس قول کی تصدیق ہوگی کہ خود سماج ہی سماجی برائیاں پیدا کرتی ہے ، پھر ایک بار اخلاق پرست مبلغ ان پر نفسانیت اور "عیش پرستی" کا الزام لگائینگے ، اور پھر ایک بار ان عصمت فروشوں کا تقابل پردہ کی قید میں رہنے والی باعصمت مستورات سے کیا جاکر اپنی برتری اور دوسروں کے نیچ پن کا منصفانہ تقابل کیا جائیگا ۔

ٹراونکور ریاست میں ۱۵ سال سے کم عمر والی بیوہ لڑکی صرف ایک ہے مگر بھاؤنگر نامی راجپوتانہ کی ریاست میں پانسو ! ان میں ۱۹۹ بیوائیں بالکل معصوم بچیاں ہیں جن کی عمریں دو سے دس سال کی ہیں ۔ ایک طرف برودا کی ترقی پذیر ریاست ہے جس نے ۱۸ سال سے کم عمر والے لڑکے یا ۱۴ سال سے کم عمر والی لڑکی [illegible] دی قابل سزا قرار دی ہے اور ۸ سال سے کم عمر والی لڑکی کا بیاہ کالعدم یعنی سوخت [illegible] قرار دیا ہے اور دوسری طرف متعدد دیسی ریاستیں ہیں جہاں ہزاروں سال پہلے کی طرح

اب تک بے جوڑ شادیاں اور بچپن کی شادیاں کرنے کی قابل شرم آزادی ہے اور اسی وجہ سے ان "آزاد" ریاستوں میں معصوم بیوائیں سیکڑوں کی تعداد میں ہیں ۔

ہندستان میں بچپن کی شادی اور انتہائی بے جوڑ شادیوں کی نحوست کی وجہ سے ایسے کئی سماجی مسئلے پیدا ہوتے ہیں جن کا اثر موجودہ اور آئندہ نسلوں کی صحت و توانائی پر پڑتا ہے ۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم اپنے ملک کی مفلسی کو کم کریں تاوقتیکہ معذور اور اپاہج، کمزور اور بیمار بچوں کی پیدائش روکنے کے لئے مناسب طریقے اختیار نہ کئے جائیں ؟ قومی صحت و توانائی کے معیار کو بڑھانا کس طرح ممکن ہے تاوقتیکہ بچپن، لڑکپن اور ابتدائی شباب کا زمانہ علم و ہنر حاصل کرنے، اور کھیل کود کے لئے وقف نہ ہو ! اگر شباب کی ابتدا کے ساتھ ہی زوجیت اور مادریت کا بار ان جسموں کو برداشت کرنا پڑے جو خود اچھی طرح نشو و نما نہ پائے ہوں اور ماں ہونے کا فرض بار بار اور جلد جلد پڑتا جائے تو نہ صرف ماؤں کی شرح اموات بلکہ بچکانی شرح اموات بھی بہت زیادہ ہوگی اور جو بچے موت سے بچ رہینگے ان میں سے اکثریت کی صحت و توانائی کا معیار بہت ادنیٰ ہوگا

ہندستان میں پانسو سے زیادہ دیسی ریاستیں ہیں جن میں سے اکثر ریاستوں میں بچکانی شادی اور انتہائی بے جوڑ شادی کا رواج اور طلاق کی ممانعت یا مخالفت اور بیوہ کی دوبارہ شادی کی مخالفت یا ممانعت گذشتہ زمانوں کی طرح قائم ہے ۔ ہندستانیوں کے پیہم اصرار پر ہندستان کے برطانوی علاقوں میں بچپن کی شادی کا تحدیدی قانون تو ۱۹۲۹ء میں نافذ ہو چکا مگر اس پر عمل کم ہوتا ہے یا رعایتیں اور تاویلیں بہت زیادہ کی جاتی ہیں ۔ مقدمے دائر کرنے والے، پیروی کرنے والے، اور عدالتیں سب کم توجہی اور بے جا قدامت سے متاثر ہیں ۔ انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو وہ

اُس کو اہم نہیں قرار دیتے) کہ سماج کی مجرمانہ رسموں کی وجہ سے کتنے لوگ مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں اور بلا قصور جسمانی تکلیف اور روحانی اذیتیں برداشت کرتے ہیں۔

راجپوتانے کے جدید گناوے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندستان کے کئی علاقوں میں اب تک قبل تاریخی عہد کی بھیانک یاد کو تازہ کرنے والی سماجی تاریکی چھائی ہوئی ہے اور ۲۸۰ بیوائیں ہیں جن کی عمریں دو دو، تین تین سال کی ہیں۔ ان میں ۲۶ بیوہ بچیاں ہیں جن کی عمریں ایک سال یا صرف چند مہینوں کی ہیں۔ ان ہی علاقوں میں پانچ ہزار (۵۰۰۰) کے قریب ان بیواؤں کی تعداد ہے جن کی عمریں دس سے پندرہ سال تک کی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان سماجی جرائم کا قصور سب سے زیادہ ہندستانی سماج پر عاید ہوتا ہے مگر ہماری حکومتیں بھی اس حد تک ضرور شریک قصور ہیں کہ وہ ان مصیبت خیز سماجی طریقوں کو گوارا کر رہی ہیں۔

ایک طرف عدل و انصاف کی تعلیم دی جاتی ہے، اخلاق کے اصول سکھائے جاتے ہیں، نسل سدھار اور حفظان صحت کے طریقے بتائے جاتے ہیں اور دوسری طرف ایسے سماجی مظالم گوارا کئے جاتے ہیں جو حفظ صحت، اخلاق اور خوشحالی کے متفقہ طور پر مانے ہوئے اصولوں کی کھلی تحقیر ہے!

ایک طرف ہم اپنی شرافت اور "روحانیت" پر ناز کرتے ہیں اور دوسری طرف ایسے تمدنی نظام کو برقرار رکھتے ہیں جس میں معاشی مفاد کی خاطر باضابطہ طور پر گناہوں کی تجارت ہوتی ہے یا سماجی جہالت کی وجہ سے معصوم بچیوں کی "شادی" ممکن ہوتی ہے حالانکہ ان ہی شادیوں کی برکت سے بیواؤں کا ہونا یقینی ہے۔ یورپ کی مادیت پر لعنہ دینے والے ہندستانی ذرا اس روحانیت کا خیال کریں کہ ہندستان کے ہر حصہ خاص کر تاریکی میں مبتلا متعدد دیسی ریاستوں میں، ایسی ہزارہا معصوم بچیاں یا کنواری

لڑکیاں ہیں جن کے کھیل کود اور پڑھنے لکھنے کے دن جاہل سماج اور گناہ گار معاشرت کی وجہ سے بیوگی میں کٹ رہے ہیں۔

ان صفحوں کا مطالعہ کرنے والے مسلمانوں کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ ان اعداد سے ہمیں واسطہ؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان سے بھی متعلق ہیں۔ فرقہ واری اعداد شاہد ہیں کہ صرف اجمیر، راجپوتانہ اور مارواڑ میں دس برس سے کم چار سو مسلمان بیوہ بچیاں ہیں۔

فلسفۂ مذہب کے ماننے والوں کا یہ پکا یقین ہے کہ اسلام نے بچپن کی شادی کی مشروط اجازت ایسے سماجی نظام کو وجود میں لانے کے لئے ہرگز نہیں دی تھی جو بیسیوں کی تعداد میں معصوم ترین ہستیوں اور بھولی بھالی بچیوں کو "بیوگی" کے دنیوی جہنم میں جھونک رہا ہو۔

مذہب کو عدل اور انصاف کا سرچشمہ قرار دینے والوں کا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ جہاں کہیں شرافت اور انسانیت کے مانے ہوئے مسلکوں کے برعکس عمل ہو رہا ہے (چاہے وہ دیوداسی طریق ہو یا انتہائی بے جوڑ شادی؛ طلاق کی ممانعت یا مخالفت ہو یا بالکل کمسنی کی شادی) وہاں سرکاری مداخلت اور قانون کے ذریعہ سماج سدھار ضروری ہی نہیں لازمی ہے۔

جب تک بروڈا اور میسور کی طرح سارے ہندستان میں کوئی ایک اصلاحی قانون نافذ نہیں ہونگے اور خاص کر بچپن کی شادی کی قطعی مخالفت یا سترہ اور ستر کی طرح انتہائی بے جوڑ شادیوں کی قانونی ممانعت نہیں ہوگی مذہب کی آڑ میں نفسانیت اور دھرم کے سایے میں درندگی پھیلتی ہی رہیگی۔

علم تمدن اور علم مرفہ الحالی، سیاسیات اور عمرانیات کا یہ مانا ہوا اصول ہے کہ قومی فلاح وبہبود کی ذمہ داری حکومت پر بھی عاید ہوتی ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام حکومتیں اس مسلک پر عمل کر رہی ہیں اور معیشت، سماج، تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے بڑھتی ہوئی شدت اور وسعت کے ساتھ قوم کے ہر معاملہ میں

مداخلت کررہی ہیں ۔ تمدنی علوم حکومتوں کے ساتھ ہیں اور مختلف پیرایوں میں بار بار اس مسلک کو دھرا رہے ہیں کہ

کسی متمدن حکومت کو	No civilized government
کسی فرقے یا ملت کی	should respeet the customs
ان رسموں اور وہم	and prejudicee of any secs
پرستیوں کی پروا نہیں کرنی	or community when these
چاہیئے جو انسانیت،	are in consistent with
اخلاق اور عقلیت کے	humanity, morality and
متضاد ہوں ۔	reason.

تمام عقلی اور تمدنی علوم کے تسلیم شدہ نظریوں کے خلاف نفس پرست جاہلوں کو یہ آزادی ہے کہ وہ "ستر، اور ستر" یا "سولہ اور ساٹھ" کے بے جوڑ جوڑے بنائیں، دو دو تین تین مہینے کی یا بہت ہی کم سن بچیوں کو بیاہ دیں، گندی جنسی بیماریوں میں برسوں سے مبتلا ہونے کے باوجود اور اپنی لاعلاج بیماری کا علم رکھتے ہوئے بھی بیاہ رچائیں ۔ ان غلط کاریوں کی وجہ سے اگر مرض زدہ، اندھے یا اور طرح پر معذور بچے پیدا ہوں تو کیا تعجب ہے ۔ ہم میں سے کتنوں کو اس بات کا علم و احساس ہے کہ گندی جنسی بیماری میں مبتلا مردوں یا ناکارہ شوہروں کی وجہ سے کتنی عورتوں کی زندگیاں دنیوی جہنم کا نمونہ بن گئی ہیں ۔

ہندستانی آبادی کا دانشمند، ترقی پسند اور جاندار طبقہ محسوس کرتا ہے کہ ہمارے مستقبل کی بھلائی ہمہ گیر تنظیم اور ہم جہتی کوشش میں مضمر ہے اور یہ ناممکن [illegible] ہوتا جارہا ہے کہ ہم اور زیادہ عرصے تک عقل اور اخلاق کی برعکس رسموں کو گوارا کریں ۔ اس سے زیادہ اخلاق کو جلا دینے اور تہذیب کو بھسم کر دینے والی رسمیں اور کون ہو سکتی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی

ہستیوں اور معصوم لڑکیوں کو سیکڑوں کی تعداد میں زندہ درگور کرکے الٹا انہیں کو منحوس اور پاپن قرار دیا جائے! سیکڑوں یا بیسوں تو بڑی بات ہے، میں کہتا ہوں کہ جس ملک میں ایک بھی سولہ تیرہ برس کی لڑکی کو مجبور کیا جا سکتا ہو کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف ساٹھ ستر کے بڈھے سے بیاہ کرے یا جہاں ایک بھی معصوم بیوہ بچی ہو وہ ملک تہذیب کا قبرستان اور تمدن کا مرگھٹ ہے

تعلیم یافتہ ہندستان

تعلیم یافتہ ہونے سے مراد پڑھا لکھا ہونا ہے اور اس کا معیار مختلف سمتوں اور علاقوں میں مختلف ہے۔ بعض شماریاتی کتابوں میں پانچ برس سے زیادہ عمر والے بچوں کا شمار بھی پڑھے لکھوں میں کیا گیا ہے۔ گنا دے کے اصحاب اقتدار پر حیرت ہوتی ہے کہ پانچ برس کی عمر والے بچوں کو "پڑھے لکھے" لوگوں میں شمار کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ حالانکہ عام طور پر پڑھے لکھے ہونے کے لئے کم سے کم دس برس کی عمر ہونی چاہئے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ بعض حیرت انگیز قابلیت رکھنے والے بچے تین سال کے اندر ہی پڑھنا لکھنا سیکھ جاتے ہیں مگر ایسی قابلیت کے بچے نہ تو ہر محلہ اور ہر کھیڑے میں ہوتے ہیں اور نہ ہر سال سیکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا پڑھے لکھے ہونے کی کمترین عمر دس سال ہونی چاہئے تھی مگر شماریاتی محکمے کے افسروں نے اپنے مطلب کی خاطر کم عمر اور کمترین معیار مقرر کیا ہے۔

معیار کے بارے میں بھی یہ کہنا فرض ہے کہ بہتیرے لوگوں نے شیخی اور نخوت میں اپنے آپ کو اور اپنے کنبہ والوں کو پڑھے لکھے لوگوں میں لکھوا دیا اور ایسی بھی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ فرقہ واری پروپگنڈے سے متاثر ہو کر لوگوں نے نہ صرف تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھا دی بلکہ اپنی مادری زبان بھی بدل دی۔ میں سیکڑوں ہستیوں سے واقف ہوں

جنہیں اپنی دستخط کے سوا کچھ لکھنا نہیں آتا، پھر بھی ان کا شمار پڑھے لکھوں میں ہوا۔ ہندی اردو کے جھگڑے کے سلسلے میں منظم پروپگنڈا کیا گیا تھا اور عام ہدایتیں شایع کی گئی تھیں کہ "اپنی مادری زبان اردو لکھواؤ" یا "تم ہندو ہو تو تمہاری زبان ہندی ہے"!

اس سلسلے میں ایک سچا لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ایک روز کناوے کے لوگ آن دھمکے۔ خاتون خانہ، گھر کی ملکہ، خود بنفس نفیس گھر والوں کی کیفیت لکھانے بیٹھیں اور ۱½ برس کے نواسے کو چھوڑ کر سب کو تعلیم یافتہ لکھوا ڈالا، نوکروں اور ملازموں کو بھی۔ سب کا مذہب ایک، مادری زبان ایک، اور تقریباً سب پڑھے لکھے! دوسرے روز سودا لانے کے لئے ملازم کو بھیجا اور دو تین بار سمجھایا کہ ۱½ سیر آلو اور پاؤ سیر اروی؛ ۸ر کے موز، ۲ پیسے کا پودینہ، چار انڈے، ایک سیر گاجر اور تھوڑی سی مرچ وغیرہ! وہ جو گیا تو سر شام لوٹا جو یاد تھا لے آیا جو بھول گیا بھول گیا؛ کہیں غلط فہمی ہوئی تو کچھ کا کچھ اٹھا لایا۔ خاتون خانہ بہت بگڑیں اور جوش عتاب میں یہ بھی کہہ دیا کہ

"موئے! دو حرف لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھتے!"

اسی طرح کے بے موقع جوش مذہب میں ہزاروں نے اپنے آپ کو صرف ہندو یا مسلمان لکھوایا اور اصلی فرقے کا حوالہ نہیں دیا۔ چند مہینے بعد جب ذیلی فرقوں کے باہمی اختلافات پیدا ہوئے تو آپس میں خوب سر پھٹول ہوئی۔ شماریاتی اعداد تمدنی مسئلوں کو حل کرنے میں استعمال کئے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ صحیح ہوں اور ایمانداری سے بیان کئے گئے ہوں۔ مگر جہاں فرضی اعداد بے ایمانی سے پیش کئے گئے ہوں اور ایک غرضمند یا مطلبی سرغنہ انہیں مان لیا ہو اور صحیح اعداد کی حیثیت سے پیش کر رہا ہو وہاں اعداد تمدنی مسئلوں کے حل کرنے کے فکرمندوں کو گمراہ کرتے ہیں اور بہکا کر یا الجھا کر اور زیادہ مصیبت میں مبتلا

کرتے ہیں۔ اگر صحیح اعداد و شمار معلوم ہوسکتے اور ہندستان کی تمام ملتوں اور جماعتوں کی تعلیمی کیفیت اعداد و شمار سے معلوم ہوسکتی تو بعض فرقہ پرست تحریکوں کے لیڈروں کو بھی فایدہ ہوتا اور وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے سے پہلے اپنے اپنے مسئلوں کو حل کرنے کی طرف متوجہ ہوتے۔

چونکہ فرقہ واری اور جماعت واری تقسیم کے لحاظ سے پڑھے لکھے لوگوں کے اعداد نہیں مل سکے لہذا ہندستان کے تمدنی مسئلوں کی اصل حقیقت بھی اچھی طرح واضح نہیں ہوتی اور صوبائی یا ریاستی اعداد سے ہمیں غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ جو کچھ بھی تعلیم اور جیسی بھی تعلیم اس صوبے یا ریاست میں ہوگی اس سے سب طبقے، جماعتیں، ملتیں اور فرقے مستفید ہو رہے ہونگے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ ہندستان میں تعلیم طبقوں، فرقوں اور جغرافی علاقوں کے لحاظ سے بہت ہی غیر منقسم ہے۔ پہلے تو تعلیم سے شہری آبادی بہت زیادہ مستفید ہوتی ہے بہ نسبت دیہاتی آبادی کے؛ مردانی آبادی نسبتاً بہت زیادہ پڑھی لکھی ہے بہ نسبت عورتوں اور لڑکیوں کے؛ ہندوؤں میں برہمن بہت زیادہ اور ہریجن بہت کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں؛ فرقائی لحاظ سے پارسی سب سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں، ان سے پیچھے عیسائی ہیں، ان کے بہت پیچھے ہندو اور سب سے آخر مسلمان۔

افسوس ہے کہ تعلیم یافتہ آبادی کے متعلق فرقائی، رقبائی اور جماعتی اعداد وغیرہ نہیں ملتے ورنہ ان سے بھی بہت مدد ملتی۔ بعض مسلمانوں کو احساس ہوتا کہ مسلمانوں کا پیسہ مسلمانوں پر خرچ کرنا اور انھیں سچا مسلمان بنانا اسکے بہ نسبت بہت زیادہ نفع بخش ہے کہ وہی رقم غیروں کو مسلمان کرنے کی کوشش پر خرچ کی جائے۔ فرقہ واری نقطۂ نظر سے اعداد و شمار اور بھی کئی وجہوں سے زیادہ اہمیت حاصل کرتے اور ان کی مدد سے زیادہ تعداد میں لوگ ہندستان کے تمدنی مسئلے سمجھ سکتے مگر اعداد نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً ہمیں کل آبادی کی تعلیمی حالت ظاہر کرنے پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔

ا۔ تعلیم یافتہ ہندستان

ہندستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد

ٹراونکور ریاست میں فی ہزار	۴۷ پڑھے لکھے ہیں
کوچین " " "	۳۵۰
بڑودا " " "	۲۲۹
کورگ " " "	۲۰۵
بمبئی کے صوبے میں " "	۱۹۰
بنگال " " " "	۱۶۱
مدراس " " " "	۱۳۰
پنجاب " " " "	۱۲۹
میسور ریاست میں " "	۱۲۲
بلوچستان میں " "	۱۰۴
بہار کے صوبے میں " "	۹۲
آگرہ و اودھ کے متحدہ صوبے میں فی ہزار	۸۵
شمال مغربی سرحدی " " " " "	[illegible]
حیدرآباد ریاست میں " "	۶۹
کشمیر " " " "	۶۶

ٹراونکور اور کوچین میں پڑھے لکھے لوگوں کی کثرت کا ایک اہم سبب عیسائیت ہے

اور تعلیمی ترقی عیسائیت کی ایک تسلیم شدہ برکت ہے۔ چند دن قبل چھوٹا ناگ پور کے اردو مرکز کی رپورٹ نظر سے گذری۔ اس میں لکھا ہے کہ

"چھوٹا ناگ پور کے عیسائیوں میں تعلیم کا اوسط
نوے فی صدی سے بھی زیادہ ہے۔ البتہ
غیر عیسائی حلقہ اور خاص کر مسلمان تعلیم میں
بہت پیچھے ہیں لیکن اب وہ بھی اپنے عیسائی
بھائیوں کی دیکھا دیکھی تعلیم کی طرف جھک رہے ہیں۔"

تاریخ کے قدیم ترین زمانے سے دوآبہ (گنگا اور جمنا سے سیراب ہونے والا علاقہ) ہندستان کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے اور آج بھی آگرہ و اودھ کے صوبے میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں (الہ آباد، بنارس، علیگڈھ، آگرہ اور لکھنو) پھر بھی (پڑھے لکھوں کی تعداد کا خیال کرتے ہوئے) یہاں قدیم زمانے کی طرح علم کا دیا ٹمٹما رہا ہے۔ ہندستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست میں بھی علم کے برقی چراغ پر ان پڑھپن کا غلاف چڑھا ہوا ہے اور ان پڑھوں کی کثرت کی وجہ سے نیم تاریکی پھیلی ہوئی ہے!

ب۔ تعلیم یافتہ ہندستان

ہندستان میں پڑھے لکھے مرد اور لڑکے

ٹراونکور ریاست کے ہر ہزار مردوں اور لڑکوں میں ۵۸۰ پڑھے لکھے ہیں اور ۴۲۰ ان پڑھ

کوچین 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۴۵۰ 〃 〃 〃 〃 ۵۵۰ 〃

بروڈا 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۳۴۰ 〃 〃 〃 〃 ۶۶۰ 〃

بمبئی کے صوبے 〃 〃 〃 〃 〃 ۳۰۰ پڑھے لکھے 〃 〃 ۷۰۰ ان پڑھ

بنگال 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۵۰ 〃 〃 〃 〃 ۷۵۰ 〃

مدراس 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۱۰ 〃 〃 〃 〃 ۷۹۰ 〃

میسور ریاست 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۹۰ پڑھے لکھے 〃 〃 ۸۱۰ ان پڑھ

اڑیسہ کے صوبے کے 〃 〃 〃 〃 ۱۹۰ 〃 〃 〃 〃 ۸۱۰ 〃

بلوچستان کے علاقے کے 〃 〃 〃 ۱۶۰ 〃 〃 〃 〃 ۸۴۰ 〃

بہار کے صوبے کے 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۶۰ پڑھے لکھے 〃 〃 ۸۴۰ 〃

آگرہ و اودھ کے متحدہ صوبوں کے ہزار 〃 〃 ۱۴۰ 〃 〃 〃 〃 ۸۶۰ 〃

کل ہندستان میں اوسطاً ہر ہزار مردوں اور لڑکوں میں ۱۲۰ 〃 〃 〃 ۸۸۰ 〃

حیدرآباد ریاست کے 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۱۰ پڑھے لکھے 〃 ۸۹۰ ان پڑھ

کشمیر 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۰۰ 〃 〃 〃 〃 [illegible]

تعلیمی ترقی کی یہ کیفیت بھی نہ ہوتی اگر سرکاری مدرسوں اور تعلیم [illegible] کے علاوہ خانگی درسگاہیں اور قومی تعلیمی ادارے نہ ہوتے۔ بہ جدید ہندستان کی یہ سب سے زیادہ

قابل قدر خصوصیت ہے کہ تعلیم کے بڑھانے اور پھیلانے میں خانگی افراد اور جماعتیں بھی کوشش کرنے لگی ہیں۔ ان کو اور زیادہ کامیابی ہوتی اگر قومی تعلیم اور سرکاری مقاصد میں تضاد نہ ہوتا۔ ایک طرف ہندوستان کی مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتیں تعلیم پر کروڑہا روپئے صرف کر رہی ہیں اور دوسری طرف وہی حکومتیں قومی تعلیم کے پھیلانے میں نت نئی رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں۔ حکومت اور قوم کے درمیان ذریعۂ تعلیم، نصاب تعلیم اور مقصد تعلیم میں متضاد رجحانوں کی وجہ سے تعلیم کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے اور یہ بھی ہندوستان میں تعلیمی ترقی کی سست رفتار کی وجہ ہے۔

پ تعلیم یافتہ ہندستان

پڑھی لکھی عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد

اصول و عمل

کہا جاتا ہے کہ آئندہ نسل کی محافظ ہونے کی حیثیت سے لڑکیوں کی تعلیم زیادہ اہم، زیادہ ضروری اور لڑکوں کی تعلیم پر مقدم ہے۔ یہ تو اصول ہے، بالکل صحیح اور بیحد منور! ۱۹۴۱ء کے اعداد کے مطابق عمل دیکھئے، بالکل برعکس اور بیحد تاریک!

ٹراونکور ریاست کی ہزار عورتوں اور لڑکیوں میں	۳۶۰	پڑھی لکھی ہیں اور	۶۴۰	ان پڑھ
کوچین 〃 〃 〃 〃 〃 〃	۲۶۵	〃 〃 〃	۷۳۵	〃
کورگ کے علاقے 〃 〃 〃 〃 〃 〃	۱۲۸	〃 〃 〃	۸۷۲	〃
بروڈا ریاست 〃 〃 〃 〃	۱۲۳	پڑھی لکھی 〃 〃	۸۷۷	〃
بمبئی کے صوبے 〃 〃 〃 〃 〃	۸۶	〃 〃 〃	۹۱۴	〃
پنجاب 〃 〃 〃 〃 〃 〃	۷۰	〃 〃 〃 〃	۹۳۰	
بنگال 〃 〃 〃 〃	۶۶	پڑھی لکھی 〃	۹۳۴	ان پڑھ
مدراس 〃 〃 〃 〃 〃	۵۶	〃 〃 〃	۹۴۴	〃
مجموعی حیثیت سے کل ہندستان کی 〃	۵۲	〃 〃 〃	۹۴۸	
میسور ریاست کی ہزار عورتوں کی 〃	۴۸	پڑھی لکھی	۹[illegible]	
آگرہ و اودھ کے متحدہ صوبوں کی 〃 〃	۲۴	〃 〃 〃	۹[illegible]	
کشمیر یا حیدرآباد ریاست 〃 〃	۲۲	〃 〃 〃 〃	۹۷۸	

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ انجمن خواتین ہند، انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسواں اور دو دیا مہلا منڈل جیسے ادارے کیا کر رہے ہیں؟ ان کی سالانہ کانفرنسوں میں دھڑلے سے تحریکوں پر تحریکیں، مطالبوں پر مطالبے اور گذارشوں پر گذارشیں پیش کی جاتی ہیں مگر کچھ کام دھام ہوتا ہواتا نہیں ہے۔ شاید ان کے کارکن نسوانی انپڑھپن کے بھیانک اعداد سے ناواقف ہیں۔ ان ہی اداروں کی ممبروں میں سے کتنوں کے بھائی یا شوہر، باپ یا بہنوی تعلیم سے وابستہ اور تعلیم کی سرپرستی کے اہل ہیں۔ اگر مرد بطور خود کچھ نہیں کرتے تو کیا عورتیں اپنے باثر عزیزوں کے ذریعہ بھی نسوانی تعلیم کے پھیلانے کے لئے معقول انتظام نہیں کر سکتیں؟ اصل بات یہ ہے کہ مردوں کی طرح ہندستان کی عورتوں کی عظیم ترین اکثریت غفلت اور خودپرستی میں مبتلا ہے۔ انہیں اپنے سے سروکار ہے، دنیا جہان سے مطلب؟ انہیں آج کے فایدہ کا خیال رہتا ہے، مستقبل کی کیا پروا؟ تن آسانی اور خود غرضی، رعونت اور جہالت میں مردوں کی اکثریت کی طرح عورتوں کی بھی اکثریت مبتلا ہے۔ شاید ان کا پلہ تھوڑا بہت بھاری ہی ہے ورنہ نسوانی آبادی میں اتنی بے علمی نہ ہوتی۔

دنیا کی زبانوں میں ہندستانی کا درجہ

سب سے زیادہ کسی زبان کے بولنے اور سمجھنے والے کتنے ہیں؟ وہ زبان کون سی ہے؟ تعدادی نقطۂ نظر سے اس کا جواب دینا آسان نہیں کیونکہ معتبر اعداد نہیں ملتے۔ بعض کہتے ہیں کہ چینی مگر دوسرے کہتے ہیں کہ چینی زبان نہیں زبانیں ہیں جن میں اتنا ہی فرق ہے جیسے پشتو اور بنگالی یا اردو اور تامل میں مگر اس کی تردید میں بھی بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس فرق کو ماننا مبالغہ کو حقیقت سمجھنا ہے۔ عام چینی بول چال عام ہندستانی کی طرح یکساں یا ملتی جلتی ہے۔ فرق گفتگو میں، لب و لہجے میں، صرفی تبدیلیوں اور نحوی ترکیبوں یا مقامی لفظوں کی بہتات میں ہے ضرور مگر اتنا نہیں کہ اسے ہم بالکل دو مختلف نوع کی زبانیں

تصور کریں۔ ان کی اساس ایک ہے۔ بہر حال زبانوں کے متعلق برے بھلے جتنے بھی اعداد مل سکے ان سے پتہ چلتا ہے کہ

زبان			تعداد	
چینی زبان اور اس کی مختلف بولیوں کے	جاننے اور بولنے والوں کی تعداد		۴۰	کروڑ ہے
انگریزی	〃	〃	۲۰	〃
ہندستانی	〃	〃	۱۶	〃
روسی	〃	〃	۱۳	〃
جرمن	〃	〃	۱۰	〃
ہسپانوی	〃	〃	۹	〃
جاپانی	〃	〃	۸	〃
فرانسیسی	〃	〃	۶½	〃
بنگالی	〃	〃	۶	〃
پرتگالی	〃	〃	۵½	〃
اٹالوی	〃	〃	۵	〃
عربی	〃	〃	۴½	〃
فارسی	〃	〃	۳½	〃
بہاری	〃	〃	۳½	〃
تلنگی	〃	〃	۳	〃
مرہٹی	〃	〃	۲½	〃
تامل	〃	〃	۲	〃
ترکی	〃	〃	۲	〃

تعداد کی تناسب اور اہمیت سے بالکل مختلف ہر زبان کی ایک اپنی [illegible] تمدنی

تجارتی، علمی اور فنی تو سیعی اہمیت ہے۔ مثلاً ہندستانی جس کا ایک مظہر اردو ہے ادبی نقطۂ نظر سے غالب، انیس، میر، اقبال جیسے مختلف النوع باکمال شاعروں کی وجہ سے بلند ترین معیار حاصل کر چکی ہے مگر تجارتی، صنعتی اور کاروباری نقطۂ نظر سے اس کا درجہ صفر کے قریب ہے۔ چینی مقید اور مفلوج ہے، انگریزی سب سے زیادہ کام آنے والی بین اقوامی زبان ہو چکی ہے۔ جرمن کا وقار سائنس اور صنعت کی وجہ سے مسلمہ ہے۔ عربی مذہب کی وجہ سے اور فارسی اپنی شیرینی اور گذشتہ عظمت کی وجہ سے باوقار زبانیں ہیں۔ توسیعی اہمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ درخشاں مستقبل ہسپانوی اور پرتگالی زبانوں کا ہے!

اعداد و شمار

اور

زبانوں کی اہمیت

محض بولنے والوں کی تعداد ملحوظ رکھی جائے تو ہندستانی (جس میں ہندی اور اردو اور ان کی مختلف قسمیں سب شامل ہیں) کا درجہ تیسرا ہے مگر ہر زبان کی عظمت محض بولنے والوں پر منحصر نہیں۔ یہ دیکھنا ہے کہ اس زبان کی علمی اور ادبی، سائنسی اور تجارتی کیا عظمت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندستانی کا درجہ بہت پست ہو جاتا ہے کیونکہ یورپ کی ترقی پذیر ملکوں کی ہر زبان میں سالانہ بیس بائیس ہزار کتابیں چھپتی ہیں اور اردو یا ہندی میں سالانہ صرف آٹھ سو!

فرانسیسی (اس سے زیادہ انگریزی اور جرمن میں)، حد درجہ انتہا یہ کہ روسی، اطالوی، ہسپانوی وغیرہ کی ہر ایک زبان میں ہزاروں کتابیں چھپتی ہیں۔ ان میں فطری علوم، ذہنی علوم

اور عمرانی علوم نیز کارآمد اور لطیف فنون پر بھی سیکڑوں عمدہ عمدہ کتابیں ہوتی ہیں مثلاً فلکیات حیاتی کیمیا، جراحی، مصوری، نقاشی، بت تراشی، مذہبیات، منطق، قدیم اور جدید یورپی اور مشرقی فلسفہ، علمیات، زبانیات، شماریات، ریاضیاتی معاشیات، انسانیات، اصول تنقید، انجنیری، ریلوے میکانیات، مصریات پر ان ترقی پذیر زبانوں میں کئی عمدہ تصنیفیں اور تالیفیں ہر سال شایع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اردو یا ہندی میں یا تو سرے سے ان پر کوئی کتاب ہی نہیں یا ہے بھی تو سالہا سال گذر جاتے ہیں مگر ان موضوعوں پر کوئی نئی کتاب شایع نہیں ہوتی۔ مثلاً منطق جیسے موضوع پر اردو میں گذشتہ آٹھ دس سال سے کوئی بھی کتاب یا تصنیف یا تالیف شایع نہیں ہوئی۔ مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے لئے بھی کئی موضوع ہیں جن پر جرمن یا انگریزی میں درجنوں کتابیں شایع ہو چکی ہیں مگر اردو یا ہندی میں ایک کتاب بھی نہیں۔ اکثر علمی شاخوں پر اردو والوں یا ہندی والوں نے کوئی توجہ نہیں کی یا توجہ کی بھی تو اپنے خیالات اور تحقیقات کو انگریزی میں شایع کیا۔

اعداد و شمار کی روشنی میں علمی اور فنی اردو یا ہندی کا درجہ غالباً تمام یورپی زبانوں سے پست تر ہے اور شاید بنگالی سے بھی۔ ہندی اور اردو کے متعلق میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اردو والوں کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ زبان کا وقار صحیح چھپی ہوئی، شایقوں یا ضرورت مند تک پہنچنے والی عمدہ کتابوں پر منحصر ہے مقفل الماریوں یا گرد آلود خانوں میں پڑی ہوئی کتابوں یا چکنے کاغذ پر غلط سلط چھپی ہوئی کتابوں پر نہیں!

ہندستان کی اہم ترین زبانیں

تلاش اور کوشش کے باوجود ہندستان میں زبانوں کے مسئلے کی توضیح کرنے والے مکمل اعداد نہیں ملے۔ البتہ اپنی واقفیت اور ہندستانی زبانوں کے مزد جہ قلاقوں اور

وہاں کی آبادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے چند اعداد معین کئے ہیں جو ظاہر ہے "علمی قیاس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

ہمارے ملک میں سب سے زیادہ جس زبان کا رواج ہے وہ آسان ہندی اور آسان اردو کی ملواز بان ہے جسے نہ اردو کہا جا سکتا ہے نہ ہندی اور جسے انگریزوں کے دئے ہوئے نام یعنے "ہندستانی" سے تعبیر کرنا صحیح ہے۔ ہندستانی سمجھنے والوں کی کل تعداد ۲۵ کروڑ ہوگی۔ البتہ ہندستانی بول سکنے والوں کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ نہیں۔ ان بیس کروڑ میں بارہ کروڑ ہندی یا ہندی مائل ہندستانی بولتے ہیں اور آٹھ کروڑ اردو یا اردو مائل ہندستانی۔ شدھ ہندی سمجھنے، بولنے اور لکھ سکنے والوں کی تعداد سارے ہندستان میں ایک کروڑ ہے تو خالص اردو سمجھنے، بولنے اور لکھ سکنے والوں کی تعداد ساٹھ ستر لاکھ ہوگی۔

اساسی ہندی اور اساسی اردو تقریباً ایک زبان ہے مگر اخباروں، رسالوں، شاعروں، ادیبوں کی زبان میں اتنا فرق ہے کہ دونوں کو ایک زبان کہنا نا سمجھی سے یا جان بوجھکر اندھیر کرنا ہے۔ تلسی داس جی کی رامائن جسے ہندی جاننے والے عوام بھی سمجھ رکھتے ہیں دکن کے پڑھے لکھے لوگوں اور اردو زبان و ادب کے بہتیرے ماہروں اور پروفیسروں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ داغ کی غزلیں یا اکبر کی نظمیں جنہیں سن کر پنجاب، یوپی اور حیدرآباد کے اردو جاننے والے لطف اندوز ہوتے ہیں ہندی جاننے والوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ہندستانی شاعر کی مثال پرانوں میں نظیر اکبرآبادی اور بیسویں صدی میں عظمت اللہ عظمت[1] ہے۔

---

[1] نظیر کا کلام (بے ڈھنگے طور پر چھپا ہوا) بازار میں ملتا ہے۔ نظیر کے کلام کو صحیح اصولوں پر مرتب کرکے صحت اور صفائی سے چھپوانے کی سخت ضرورت ہے۔ عظمت کا کلام "سریلے بول" کے نام سے ۔۔۔ میں چھپا تھا۔ اب نایاب ہے۔ ان دونوں کا بلند پایہ ادب اردو اور ہندی دونوں لکھاوٹوں میں شائع کرنے کے قابل ہے۔

اپنے معین کردہ اعداد کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کرسکتا کہ کن طریقوں سے میں نے یہ اعداد اخذ کئے ہیں البتہ میں اس بات کو دوبارہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ ان کی اہمیت علمی قیاس آرائی سے زیادہ نہیں۔ غرض میرے اندازے اور قیاس کے مطابق

ہندستانی	(آسان ہندی یا اردو سمجھنے والوں کی تعداد)	۲۵ کروڑ ہے
ہندستانی	(" " " بول سکنے " " ")	۲۰ "
ہندی "	(سمجھنے اور بولنے والوں کی تعداد)	۱۲ "
شدھ ہندی	(بولنے اور لکھ سکنے والوں کی تعداد)	۱ "
اردو	(سمجھنے اور بولنے والوں کی تعداد)	۸ "
خالص اردو	(بولنے اور لکھ سکنے والوں کی تعداد)	× × ۶۵ لاکھ ہے
بنگالی جاننے والی آبادی[1]		۶ کروڑ ہے
تلنگی " " "		۳ "
بہاری		۳ "
تامل		۲¼ "
مرہٹی		۲¼ "
پنجابی		۲ "
کنڑی		۱ " ۲۵ لاکھ
اڑیا		۱ " ۲۵ "
گجراتی		۱ " ۲۵ "
ملیالم		

[1] ان زبانوں میں لکھنا پڑھنا جاننے والوں کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں کیا گیا۔

سندھی	۵۰ لاکھ
آسامی	۲۵ "
پشتو	۲۵ "
کشمیری	۲۵ "

ہندستان میں زبانوں کا مسئلہ کبھی اتنا پیچیدہ نہ ہوتا اگر ہندی اردو کا جھگڑا پیدا نہ کیا جاتا۔ اس جھگڑے سے صرف انگریزی مستفید ہو رہی ہے جو تیزی سے ہندستان میں پھیلتی اور اہم ترین سماجوں اور جماعتوں کی زبان ہوتی جا رہی ہے۔ تمام یا تقریباً تمام کل ہند اداروں کی کاروباری زبان انگریزی ہے۔ حد تو انتہا یہ کہ ہندستانی کانگریس، ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ کی دفتری اور کاروباری زبان بھی انگریزی ہے۔ تمام، کل ہند علمی کانفرنسوں اور رفاہی اداروں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ اعزاز ہندستانی کا حق تھا اور اسے اب بھی مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندی اور اردو زبانوں کے لئے ایک رسم خط اختیار کیا جائے اور دونوں کے لئے قابل قبول یا قابل برداشت رسم خط بین اقوامی رسم خط ہی ہو سکتا ہے۔

ہندی اور اردو میں نہ صرف اختلاف بڑھ رہا ہے بلکہ یہ زبانیں بین اقوامی بفرقہ وارہی ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک دو پیڑھی قبل لاکھوں ہندو گھرانے جس اردو کے دل دادہ تھے وہ اردو کو ترک کر چکے اور اس سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ اردو اپنے ملکی سرمایہ کو نظر انداز کر کے فارسی اور عربی کے بھیانک الفاظ لیتی جا رہی ہے اور اسی گمراہی میں ہندی پریمی ہیں جو خواہ مخواہ مروج لفظوں کو "قتل" کرنا چاہتے ہیں اور ان کی بجائے مردہ لفظوں کو جلانے کی کوشش میں اپنی قوت صرف کر رہے ہیں۔ زبانوں کی حد تک ہندستان کے دونوں بیٹے، ہندی پریمی اور اردو کے حامی، کپوت نکلے اور جیسی زبان حیدرآباد یا پنجاب کے دفتروں اور علمی اداروں یا اخباروں اور رسالوں میں لکھی اور فرض غرض سے بولی جاتی ہے وہ کہیں کی مادری زبان نہیں۔ وہ اردو نہیں یا ایسی اردو ہے جو خود تعلیم یافتہ اردو والوں کے کچھ سمجھ نہیں آتی۔

اعداد کی روشنی میں ہندی اردو کا مسئلہ

۱۹۳۱ء میں آگرہ اور اودھ کے متحدہ صوبوں کے اردو مطبوعات						۳۸۷	تھے
۱۹۳۲ء	"	"	"	"	"	۴۰۱	
۱۹۳۳ء	"	"	"	"	"	۳۰۶	
۱۹۳۶ء	"	"	"	"	"	۲۵۴	
۱۹۳۸ء	"	"	"	"	"	۱۷۲	

جو لوگ اس دل خوش کن مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اردو دن بہ دن ترقی کر رہی ہے بلکہ "دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے"۔ انھیں مولوی عبدالحق صاحب کے ان الفاظ پر غور کرنا چاہیئے جو اپریل ۱۹۴۳ء کے "اردو" سے منقول ہیں:

"یہ اعداد بہت ہمت شکن اور مایوس کن ہیں۔ ان ہی اعداد کو دیکھ کر بعض زمانہ شناس صاحبوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اردو اس صوبے میں چند سال کی مہمان ہے۔ ایک مدت پہلے معاملہ اس کے برعکس تھا اور ہندی اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی"

اردو کی مقبولیت یا تنزل پذیری کا اندازہ اخباروں کی تعداد، ان کی شاعت، رسالوں اور کتابوں کی تعداد اور ہر رسالے یا کتاب کے خریداروں کی تعداد، مختلف امتحانوں میں ہندی یا اردو کا انتخاب کرنے والے طالب علموں کی

تعداد اور تناسب، مدیروں اور مصنفوں، اردو ناشروں اور کتابیں پڑھنے والوں کی تعداد نیز ان کی قومیت اور فرقہ واریت ہی سے ہو سکتا ہے۔
ان میں سے صرف بعض کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی صاحب نے آدھ صدی قبل اردو کی مقبولیت اور موجودہ زمانے میں اس کی محدودیت کو واضح کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے:

> "آپ نے دیکھا، حالت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے؟ ان واقعات کے سامنے آپ کی زبان دانی، شعر و شاعری اور ترقی پسندی کے دعوے سب ہیچ ہیں۔ اعداد پکارے بول رہے ہیں کہ اگر آپ نے جلد خبر نہ لی تو حالت اس سے بدتر ہونے والی ہے۔"

اسی کے ساتھ سر تیج بہادر سپرو کے اس قول کو ملحوظ رکھئے کہ

> "ہندو اردو چھوڑتے جاتے ہیں۔ اب تک مجھے یہ توقع تھی کہ کائستھ اور کشمیری پنڈت ہمارا ساتھ دینگے لیکن افسوس وہ بھی ہٹتے جاتے ہیں۔"
> ("اردو" ۱۹۴۳ء صفحہ ۲۴۸)

گویا "قطعاً ناقابل تقسیم" ورثے سے ورثہ دار خود ہی ہٹتے جا رہے ہیں! پھر بھی عام طور پر اردو داں اس گمراہ کرنے والے مغالطے میں مبتلا ہیں کہ
"اردو عالمگیر زبان ہوتی جا رہی ہے"
اس میں شک نہیں کہ پنجاب اور دکن میں اردو کی اہمیت بڑھ رہی ہے، اور فرقہ واریت کے تحت بنگال اور مالابار میں اردو کو پھیلانے کی تھوڑی بہت کوشش کی جا رہی ہے جو ایک حد تک کامیاب ہوگی مگر لوگ اس امر کو بھول رہے ہیں کہ

اردو، شستہ اور شائستہ اردو کا گہوارہ اور ٹکسال دوآبہ تھا اور ہے۔ گنگا اور جمنا کی دھاراؤں سے سیراب ہونے والے علاقوں ہی میں اب تک اردو ادب کے بڑے بڑے ادیب، انشاپرداز اور شاعر پیدا ہوتے رہے ہیں! اس علاقہ کے باہر جتنے لوگوں نے خالص ادب میں نام کیا ہے وہ دراصل دوآبہ میں تعلیم اور تربیت یافتہ تھے۔ ان کے علاوہ جنہوں نے نام حاصل کیا وہ زیادہ تر وسعت کار، بلندیٔ فکر، میکانی معلومات اور فنی صلاحیتوں کی وجہ سے۔ دوامی اردو ادب کا حقیقی سرچشمہ گذشتہ زمانوں کی طرح اب بھی آگرہ اور اودھ کے صوبے ہیں۔ اگر یہ سرچشمے ہی سوکھ گئے تو پھر اردو کہاں رہے گی۔ جب سمندر ہی سوکھ جائے تو کہاں کے بادل، اور کدھر کی بارش!

میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ انتہائی یاس انگیز حالت پیدا نہ ہوگی اور آگرہ اور اودھ کے اردو والوں کو ہر وقت اس کا احساس ہوگا کہ وہ اپنی گھٹتی ہوئی تعداد اور گھٹتے ہوئے تناسب کا انسداد کریں اور ٹکسالی اردو کے سرچشموں کو متاثر نہ ہونے دیں، تاہم ہمعصر شماریات ہمیں ان خطروں سے آگاہ کر رہی ہے جن کا دھیان نہ کیا جائے اور ان کو دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو لاعلاج خرابی پیدا ہو جائے گی۔ شماریات ہمیں حقایق سے آگاہ کرتی ہے چاہے وہ تلخ ہی کیوں نہ ہوں۔ اعداد و شمار کا علم ہمیں سنبھلنے کا موقع دیتا ہے بشرطیکہ لوگوں میں سدھار کی آرزو ہو۔

مالونہ مالو

معتبر ذریعوں سے حاصل کردہ معلومات کی امکانی تحقیق اور مختلف بیانوں کے باہمی تقابل اور تفتیش کے بعد اندازہ کیا گیا ہے کہ بڑودہ ریاست میں سو برس سے زیادہ عمر والے لوگوں کی تعداد ۸۹ ہے۔ ان میں ۳۲ مرد ہیں اور ۵۷ عورتیں
ان اعداد سے از سر نو اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ عورتیں جب نوجوانی، جوانی اور ادھیڑپن میں مادریت کے خطروں سے گذر چکتی ہیں تو ان کی عمریں مردوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ گھریلو سکون سے بھی ان کی مدت حیات بڑھتی ہے اس کے برعکس مرد تمدن کی کشمکش میں زیادہ مبتلا رہتے ہیں، ان کے کاروبار، دلچسپیاں اور نفس پرستیاں انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے اسی لئے ان کے اعصاب پر تباہ کن اثر زیادہ ہوتا ہے اور وہ نسبتاً جلد مرکھپ جاتے ہیں۔

ہر جگہ لڑکے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور لڑکیاں کم۔ اندازاً ہزار لڑکے پیدا ہوں تو ۹۴۵ لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں!
خاص کر پہلن اولاد کا لڑکا ہونا اور بھی عام ہے۔ اندازاً ہزار عورتوں کی پہلن اولاد لڑکا ہے تو ۸۵۰ کی لڑکی!

دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں مردم شماری ہوئی اس وقت جنگ کی وجہ سے گورے زائد سپاہی ہزاروں کی تعداد میں آچکے تھے پھر بھی سارے ہندستان میں گوروں کی تعداد ...،۳۵،۱ تھی جس میں سرکاری افسر، فوجی سپاہی، تاجر اور سیاح سب شریک ہیں۔ گویا ...،...،۳۹ ہندستانیوں پر حکومت کرنے کے لئے صرف ایک اور ایک تہائی لاکھ انگریز کافی تھے! اس لحاظ سے ایک گورا تین ہزار گندمیوں اور کالوں پر حکمرانی کے لئے کافی تھا! وہ بھی جنگ کے زمانے میں!

سارے ہندستان میں روزانہ ...،۴۴،۳ بچے پیدا ہوتے ہیں اور ماں بننے کا فرض انجام دیتے ہوئے سالانہ دو لاکھ پچاس ہزار عورتیں موت کا شکار ہوتی ہیں۔ کم عمری کی بار بار اور جلد جلد زچگیاں، کم خوراک اور جہالت اس کے اہم اسباب ہیں۔

کہا گیا ہے "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ"۔ "علم حاصل کرنا تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر فرض ہے" پھر بھی پارسی خواتین میں فی ہزار ۵۰۰، پڑھی لکھی ہیں اور مسلمان خواتین میں فی ہزار صرف ۱۶۔

گذشتہ چالیس سال میں یعنی ۱۹۰۱ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان حیدرآباد ریاست کے مسلمانوں میں تناسب کے لحاظ سے صرف ۲۳ فی صد کا اضافہ ہوا اور ان کی تعداد دس فی صد سے ۱۲ فی صد ہو گئی۔ اسی مدت میں عیسائیوں کی تعداد میں ۶۱۹ فی صد اضافہ ہوا!

۲۳ ھ اور ۶۱۹ ھ کی رفتار کا تقابل کریں تو ۲۳ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی سست پسنجر اور ۶۱۹ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے تیز ہوائی جہاز کا خیال آتا ہے! اور لطف یہ (جیسا کہ عام طور پر شبہ کیا جاتا ہے) ہندوؤں کی طرح مسلمانوں نے اپنی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھائی ہے اور عیسائیوں نے گھٹا کر! جو لوگ اعداد و شمار کے حقایق سے واقف نہیں، پھر بھی فرقہ واری مسئلوں پر تبصرہ کرتے اور فرقہ واریت میں حصہ لیتے ہیں، ان کی مثال ان رتوندھے فلسفیوں کی سی ہے، جو اندھیری رات میں کالی بلی کی تلاش کرتے سارے گھر میں پریشان پھرتے ہیں!

انگلستان کا رقبہ بلوچستان سے کچھ چھوٹا اور سندھ یا آسام کے صوبہ سے کچھ بڑا ہے۔ اور وہاں کی آبادی بہار کے صوبہ کے برابر تقریباً ۳ کروڑ ہے۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے کے اعداد کے مطابق برطانوی شہنشاہیت کا کل رقبہ ۱ کروڑ چوکور میل ہے اور اس کی آبادی ۵۵ کروڑ گویا انگلستان دنیا کی چوتھائی زمین پر مسلط ہے اور چوتھائی آبادی پر حکمران ہے۔

نجی رقبے کے مقابلے میں انگلستان ڈھائی سو گنی زیادہ سرزمین پر قابض ہے

پچاس برس سے زیادہ عمر والی آبادی میں بیواؤں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، رنڈووں کی کم! یہ ہر ملک کی عام کیفیت ہے۔ اس حقیقت سے ظریفانہ انداز میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کو پریشان کر کر کے مارے ڈالتی ہیں! گویا ہر ملک اور ہر زمانے میں ظالم مردوں سے زیادہ تعداد مظلوم زن مریدوں کی ہوتی ہے!

یہ خیال دل خوش کن سہی مگر حقیقت میں منطقی غلطی ہے۔ قدرت نے مردوں اور عورتوں کی عمریں تقریباً برابر رکھی ہیں۔ وہی "تین بیس" ... "شادی"...

وقت عام طور پر مرد کی عمر عورت سے زیادہ ہوتی ہے، لہذا طبیعی عمر کو پہنچ کر مرد پہلے مرجاتے ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ پچاس برس سے زیادہ عمر والی آبادی میں بیوائیں زیادہ ہیں رنڈوے کم۔

یورپ کی شماریات آبادی کی یہ عام خصوصیت ہے کہ شادی شدہ مردوں کی اوسط عمر بن بیاہوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے! رفیقۂ حیات بن کر اور اپنی قسمت اور مفادوں کو اپنے شوہر سے وابستہ پانے کے بعد ہر عورت اپنے سہاگ کو قائم رکھنے کی فطرتاً کوشش کرتی ہے اور نا اعترافیوں اور شکایتوں بلکہ احسان فراموشیوں کے باوجود پتی سیوا کرتی رہتی ہے! بن بیاہے مردوں کی جان وصحت کی ہر وقت خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور وہ نسبتاً جلد فنا ہو جاتے ہیں۔

"کوئی شہر نجی آبادی سے زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"اگر دیہات سے لوگ آ آکر شہروں میں نہ بسیں تو شہر فنا ہو جائیں"

ان حقایق سے یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک نہیں کہ

"دیہات آبادی کا سرچشمہ اور شہر مرگھٹ اور قبرستان ہیں!"

یا یہ کہ

"شہروں کی صحت خراب ہوتی ہے اور زیادہ لوگ مرتے ہیں!"

شہر نجی آبادی پر قائم اس لئے نہیں رہ سکتے کیوں کہ شہروں میں مردانی آبادی زیادہ، بعض شہروں میں بہت زیادہ ہوتی ہے! ظاہر ہے کہ جہاں آبادی زیادہ تر مردوں پر مشتمل ہوگی وہ نجی طور پر اپنی تعداد میں اضافہ نہیں کر سکیگی!

ملنے کا پتہ

حیدر آباد بک ڈپو

اسٹیٹ بنک روڈ

حیدر آباد دکن